۲

۲۳ اعتراضات سیریز

شَقُّ القمر

تفہیم و تبیین

جاوید احمد غامدی

(محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے کی روشنی میں لکھا گیا)

تالیف

سید منظور الحسن

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

شق القمر

تفہیم و تبیین

جاوید احمد غامدی

شق القمر

تفہیم و تبیین

جاوید احمد غامدی

(محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے کی روشنی میں لکھا گیا)

تالیف

سید منظور الحسن

(معاونت: شاہد محمود)

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر: غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

طابع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

طبع دوم: جون 2025ء

قیمت: 980 روپے

ISBN:979-8-9886271-1-1

Address: 3620 N Josey Ln, Suite 230 Carrollton, TX 75007

Website: www.ghamidi.org

Email: info@ghamidi.org

فہرست

دیباچہ 9

تعارف 11

باب اول: 'آیۃ' کا مفہوم اور مصداق 15

انفس و آفاق میں معمول کے مطابق ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی 22

1۔ انسان کی تخلیق اور نشوونما 25

2۔ انسان کی جنس سے اُس کے جوڑے کی تشکیل 26

3۔ زمین اور آسمانوں کی تخلیق 27

4۔ انسانوں کی زبانوں اور رنگوں میں اختلاف 28

5۔ گردشِ لیل و نہار 30

6۔ بادلوں کی گرج چمک اور برسات 32

7۔ زمین و آسمان کا قیام و دوام 33

انفس و آفاق میں معمول کے خلاف ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی 36

1۔ عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ کے پیدائش اور گہوارے میں گفتگو 37

2۔ بنی اسرائیل پر بدلیوں کے سایے اور من و سلویٰ کی نعمتیں 41

3۔ بنی اسرائیل پر کوہِ طور کا معلق ہونا 42

4۔ اصحاب کہف کا قریباً دو سو سال تک سوئے رہنا 44
انفس و آفاق میں نبیوں کے ہاتھوں پر ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی 47
1۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات 60
2۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات 67
3۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات 69
انفس و آفاق کی جملہ آیاتِ الٰہی کو بیان کرنے والی آیاتِ قرآنی 77
باب دوم: شق قمر کا واقعہ —— قرآنِ مجید کی روشنی میں 83
شق قمر کے واقعے کی نوعیت 86
شق قمر کے واقعے کا مقصد 91
باب سوم: شق قمر کا واقعہ —— احادیث و آثار کی روشنی میں 97
شق قمر کے وقوع کا زمانہ 98
شق قمر کا مشاہدہ کرنے والے اصحاب کی روایات 99
1۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت 100
2۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی روایت 104
3۔ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی روایت 105
شق قمر کا مشاہدہ نہ کرنے والے اصحاب کی روایات 107
1۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی روایت 107
2۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت 108

3۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت 110
4۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت 111
روایتوں کا تجزیہ اور تقابلی جائزہ 113
باب چہارم: شق قمر کا واقعہ: مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کا موقف 121
سورۂ قمر کا موضوع اور مخاطبین 122
'انْشَقَّ' سے مراد ماضی یا مستقبل کا واقعہ 124
واقعے سے متعلق آیات اور روایات کا باہمی تعلق 126
معجزۂ رسالت یا آیتِ الٰہی 126
رسالتِ محمدی کی تائید و تصدیق 129
خلاصۂ مباحث 131
ضمیمہ جات 137
ضمیمہ 1: ''معجزہ'' کا مفہوم اور شق قمر کے واقعہ پر اُس کا اطلاق 139
ضمیمہ 2: شق قمر کے واقعے پر مورخین کی خاموشی: ایک اعتراض کا جواب 145
ضمیمہ 3: شق قمر پر ماہرین فلکیات اور سائنس کی خاموشی: ایک اعتراض کا جواب 150
ضمیمہ 4: لفظ 'آیۃ' کے مختلف مصداقات: ایک اشکال کی وضاحت 154

بسم الله الرحمن الرحيم

دیباچہ

”شق القمر“ کے زیرِ عنوان یہ تحریر استاذِ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی کے موقف کا بیان ہے۔ اِسے اُن کی ویڈیو سیریز ”غامدی صاحب کے فکر پر 23 اعتراضات کے جواب میں“ کی اقساط 38 تا 39 سے اخذ کیا گیا ہے۔ اِس سیریز میں روایتی مذہبی فکر کے وہ اعتراضات زیرِ بحث ہیں، جو غامدی صاحب کے افکار پر بالعموم کیے گئے ہیں اور جنھیں علما کی اجماعی آرا کے مقابل میں اُن کے تفردات کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ در حقیقت قرآن و سنت اور حدیث و سیرت کے مختلف مباحث کی رائج تعبیرات ہیں۔ غامدی صاحب نے اِنھیں قرآن و سنت کے نصوص اور حدیث و سیرت کے حقائق کے خلاف قرار دے کر جزواً یا کلیتاً قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔

اِس سلسلۂ مباحث میں سوال و جواب اور بحث و مکالمے کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ شریکِ گفتگو محمد حسن الیاس صاحب ہیں۔ اُنھوں نے تمام بحثوں کو بالاستیعاب ترتیب دے کر نہایت خوش اسلوبی سے استاذِ گرامی کے سامنے پیش کیا ہے۔ استاذِ گرامی نے جوابی گفتگو میں روایتی نقطۂ نظر کی تشریح کی ہے، اُس کے دلائل کا تجزیہ کیا ہے اور اُس کے مقابل میں اپنے موقف کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

راقم اِس سلسلۂ مباحث کو مقالات کی صورت میں تالیف کر رہا ہے۔ اِس کے لیے تفصیلی بحثیں اجزا میں تقسیم کی ہیں اور اشارات کی وضاحت اور اجمالی نکات کی تفصیل کی ہے۔ حسبِ موقع استاذِ گرامی کی تصانیف سے متعلقہ اقتباس نقل کیے ہیں۔ تشریح و توضیح اور تائید و تاکید کے لیے جلیل القدر اہل علم کی کتابوں کے حوالے بھی درج ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ جو موضوعات آڈیو ویڈیو کی صورت میں دستیاب ہیں، وہ تحریری شکل میں بھی سامنے آ جائیں تاکہ طلبہ اور محققین کے لیے اُن سے استفادہ آسان ہو جائے۔ تحقیقی معاونت کے لیے شاہد محمود صاحب کی خدمات مختص ہیں۔ وہ یہ کام نہایت ذمہ داری سے انجام دے رہے ہیں۔ ترتیب و تدوین کے کام میں اُن کے ساتھ معظم صفدر صاحب اور شاہد رضا صاحب بھی شامل ہیں۔

یہ مقالات استاذِ گرامی کے افکار کے بارے میں راقم کے فہم کا بیان ہیں، تاہم خوش نصیبی ہے کہ یہ اُن کی نظر ثانی سے بھی گزر رہے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں فہم و بیان کے نمایاں تسامحات کی اصلاح ساتھ ساتھ ہو رہی ہے۔

دینی موضوعات پر استاذِ گرامی کے اعلیٰ علمی مباحث کو اُنھی کے مکالمات سے اخذ کر کے تحریر کرنا اور اِس مقصد کے لیے اُن کی اصولی رہنمائی کا میسر ہونا شرف و امتیاز کا باعث ہے۔ یہ پروردگار کی عظیم عنایت ہے، جو راقم کی اہلیت اور بساط سے یقیناً بہت بڑھ کر ہے۔ الحمد للہ۔

مذکورہ ویڈیو سیریز کی تشکیل اور اُس پر مبنی اِس سلسلۂ مقالات کی تالیف کا کام ”غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ“ کے زیرِ اہتمام جاری ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ادارے اور افراد کی اِس اجتماعی کاوش کو قبول فرمائے۔ آمین۔

اکتوبر 2023ء

——**منظور**

تعارف

’’شق القمر‘‘ کو رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان معجزہ قرار دیا جاتا ہے۔ مفسرین، محدثین اور سیرت نگار اِسے سورۂ قمر (54) کی ابتدائی آیات اور کتبِ حدیث کی متعدد روایات کی بنا پر قبول کرتے ہیں۔ سورۂ قمر میں ارشاد ہوا ہے کہ قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند شق ہو گیا ہے، مگر رسول کے مکذبین نہیں مانیں گے۔ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، یہ اُس سے اعراض ہی کریں گے اور کہیں گے کہ یہ تو جادو ہے، جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔ احادیث میں بیان ہوا ہے کہ شق قمر ایک حسی واقعہ تھا، جو ہجرتِ مدینہ سے کم و بیش پانچ سال پہلے پیش آیا تھا۔ اِس کے عینی شاہدین میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابۂ کرام اور کفارِ قریش شامل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب منیٰ میں موجود تھے۔ چاند بدرِ کامل کی صورت میں تھا اور واضح نظر آرہا تھا۔ یک بہ یک وہ پھٹا اور دو ٹکڑے ہو کر الگ ہو گیا۔ ایک ٹکڑا پہاڑ کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف چلا گیا۔ یہ حیرت انگیز منظر لحظہ بھر کے لیے قائم رہا اور پھر دونوں ٹکڑے آپس میں مل گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم اِس واقعے کے گواہ رہنا۔ کفار نے یہ منظر براہِ راست دیکھا، مگر اُنھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اِس لیے اُنھوں نے اِسے جادو کہہ کر جھٹلانے کی کوشش کی۔ اُن میں سے بعض نے تجویز دی کہ حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے سفر پر گئے ہوئے لوگوں کو واپس آلینے دیں۔ اُن کا مشاہدہ فیصلہ کن ہو گا، کیونکہ ہماری آنکھیں تو مسحور

ہو سکتی ہیں، مگر غیر موجود ہونے کی وجہ سے وہ سحر زدہ نہیں ہو سکتے۔ یہ تجویز قبول ہوئی۔ جب لوگ آئے تو معلوم ہوا کہ اُنھوں نے بھی بعینہٖ چاند کے پھٹنے کا مشاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ کفار کے لیے واقعے کا انکار ممکن نہیں رہا۔ تاہم، اِس کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار کی تردید و تکذیب پر کمربستہ رہے۔

یہ حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت جبیر بن مطعم، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم اور بعض دیگر صحابۂ کرام کی روایات کا مجموعی مفہوم ہے، جس کی صحت پر مفسرین و محدثین کا اتفاق ہے۔ اِس متفق علیہ مفہوم پر حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منسوب بعض طرق میں یہ اضافہ شامل ہے کہ یہ واقعہ قریش کے مطالبۂ نشانی کا جواب تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات دو مرتبہ رونما ہوا تھا۔ علما و محدثین میں سے بعض نے اِس اضافے کو قبول کیا ہے اور بعض نے راویوں کا تسامح قرار دے کر رد کیا ہے۔

شق قمر کے وقوع پر علما کے عمومی اتفاق کے باوجود اِس کی معجزانہ نوعیت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حدیث و تفسیر کے اکثر علما اِسے معجزاتِ نبوت میں شامل کرتے اور اِس کے صدور کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرتے ہیں۔ بعض دیگر علما اِسے اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیتے ہیں، مگر معجزے کی معروف اصطلاح کا اطلاق اِس پر نہیں کرتے۔ اُن کے نزدیک اِسے معجزاتِ نبوت میں شمار کرنا علمی اور اصطلاحی لحاظ سے درست نہیں ہے۔ عصرِ حاضر کے دو جلیل القدر علما مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی اِسی موقف پر قائم ہیں۔

استاذِ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی شق القمر کی بحث کے تمام اجزا میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی مجموعی راے سے متفق ہیں۔ اُنھوں نے اِسی کو اپنے موقف کے طور پر بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ شق قمر کو ایک حسی واقعہ مانتے اور پروردگارِ عالم کی قدرتِ کاملہ کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ کے

انذار کی تائید اورآپ کے مکذبین کی تنبیہ کے لیے ظاہر ہوا تھا۔ اپنے موقف کی بنا وہ قرآنِ مجید پر قائم کرتے ہیں، مگر اُس کی تائید و تفہیم میں مستند روایات کو پوری طرح قبول کرتے ہیں۔ اِس واقعے کی تعبیر کے لیے وہ معجزے کی اصطلاح کو صحیح نہیں سمجھتے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط کو اختیار نہیں کیا گیا۔ سورۂ قمر میں اِس کے لیے 'آیة' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں اِس کے نظائر سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اگر معجزہ کی متداول اصطلاح اختیار کرنا مقصود ہو تو اُسے صرف اُن نشانیوں کے لیے اختیار کرنا چاہیے، جو انبیا علیہم السلام کی وساطت سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست ظاہر ہونے والی نشانیوں کے لیے یہ اصطلاح موزوں نہیں ہے۔

زیرِ نظر تصنیف استاذِ گرامی کے اِسی موقف کا بیان ہے۔ یہ چار ابواب اور چند ضمیمہ جات پر مشتمل ہے۔ تمہیدی باب کا عنوان "آیة کا مفہوم اور مصداق" ہے۔ اِس کی حیثیت اگلے مباحث کے لیے اساس کی ہے۔ اِس میں قرآن کے نظائر کی بنا پر لفظِ 'آیة' کے اطلاقات کا تعین کیا گیا ہے۔ اِس کی روشنی میں سورۂ قمر میں اِس لفظ کا مصداق پوری قطعیت کے ساتھ متعین ہو جاتا ہے۔ دوسرے باب کا عنوان ہے: "شق قمر کا واقعہ —— قرآنِ مجید کی روشنی میں"۔ اِس میں پہلے باب کے مباحث کے تناظر میں سورۂ قمر کی متعلقہ آیات کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اِس ضمن میں شق قمر کی نوعیت، حقیقت اور غرض و غایت کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ تیسرے باب میں شق قمر کی روایات کا تجزیہ کیا ہے۔ اِس میں تمام بنیادی روایات اور اُن کے جملہ مباحث زیرِ بحث آئے ہیں۔ چوتھا باب موضوعِ زیرِ بحث پر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے نقطہ ہاے نظر کا خلاصہ ہے۔ اِس کا مقصد یہ ہے کہ وہ مواقف جن سے استاذِ گرامی نے بالکلیہ اتفاق کیا ہے، اپنے اصل ماخذوں کے ساتھ سامنے آ جائیں اور یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے کہ استاذِ گرامی کی راے اُن کا تفرد نہیں، بلکہ دو مقدم اصحاب علم کی آرا کا مکرر بیان ہے۔

آخری حصہ ضمیمہ جات پر مشتمل ہے۔ اِس میں علمی اور فنی تقاضوں کے پیشِ نظر مواد کے بعض اہم اجزا اور چند توضیحی مباحث شامل کیے ہیں۔ اِن سے مقصود یہ ہے کہ قارئین اگر مزید تنقیح کے خواہش مند ہوں یا بحث کے مصادر تک رسائی چاہیں تو اُنھیں سہولت فراہم ہو جائے۔

باب اول

’آیۃ‘ کا مفہوم اور مصداق

شق قمر کے واقعے کو قرآنِ مجید نے ’آیۃ‘ سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ وَاِنۡ يَّرَوۡا اٰيَةً يُّعۡرِضُوۡا وَيَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ. (القمر54: 1-2)	”وہ گھڑی قریب آ گئی، جس سے اِنھیں خبر دار کیا جا رہا ہے اور چاند شق ہو گیا۔ (مگر یہ نہ مانیں گے) اور خواہ کوئی آیت دیکھ لیں، اُس سے منہ ہی موڑیں گے اور کہیں گے: یہ تو جادو ہے، جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔“

’آیۃ‘ عربی زبان کا نہایت معروف لفظ ہے۔ اِس کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔ اِس سے وہ مظاہر مراد ہیں، جو کسی مضمر شے یا حقیقت یا واقعے کی نشان دہی کریں۔ مثال کے طور پر نشاناتِ راہ راستوں کا پتا دیتے ہیں، آثارِ قدیمہ اجڑے دیار کی یادگار ٹھہرتے ہیں اور تخلیقات اور مصنوعات اپنے اپنے خالق یا صانع سے باخبر کرتی ہیں۔[1] اِن کا باہمی تعلق گویا اشارہ اور مشار الیہ کا ہوتا ہے، جو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآنِ مجید کے بعض مقامات پر لفظِ ’آیۃ‘ اِس لغوی معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ سورۂ یونس

[1] لسان العرب 8/ 58۔ المفردات فی غریب القرآن 33۔

میں فرعون کی لاش کو عذاب الٰہی کے واقعے کی نشانی کے طور پر باقی رکھنے کا فیصلہ مذکور ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ. (92:10)

”سو آج ہم تیرے بدن کو بچا لیں گے تاکہ اپنے بعد آنے والوں کے لیے تو (خدا کے عذاب کی) نشانی بن کر رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہی رہتے ہیں۔“[2]

سورۂ شعراء میں قوم عاد کے اِس عمل کو کارِ لاحاصل قرار دیا ہے کہ وہ بلند و بالا عمارتوں کی صورت میں اپنی عظمت کے نشان قائم کرتے تھے۔ ارشاد ہے:

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ. وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ. (129-128:26)

”(یہ تمھارا کیا حال ہے)؟ کیا ہر اونچی زمین پر تم اِسی طرح لاحاصل یاد گاریں بناتے رہو گے؟ اور اِسی طرح

[2] ”خدا کی یہ بات حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ فرعون کی لاش کو غرقابی کے بعد سمندر نے قبول نہیں کیا، بلکہ عذابِ الٰہی کی ایک عبرت ناک نشانی کے طور پر باہر پھینک دیا۔ یہ لاش بعد میں لوگوں کو ملی بھی اور اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا کے مقابلے میں سرکشی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر جبل فرعون اور حمام فرعون اِسی واقعے کی یادگاریں ہیں۔ ابوزنیمہ سے چند کلومیٹر اوپر شمال کی جانب علاقے کے باشندے آج بھی اُس جگہ کی نشان دہی کرتے ہیں، جہاں یہ لاش پڑی ہوئی ملی تھی۔ دورِ حاضر میں اہل مصر کی جو ممی کی ہوئی لاشیں دریافت ہوئی ہیں، اُن میں سے بھی ایک لاش کے بارے میں، جسے فرعون منفتہ کی لاش قرار دیا جاتا ہے، عام خیال یہ ہے کہ یہ اُسی فرعون کی لاش ہے۔ یہ لاش قاہرہ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے اور زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔“ (البیان 2/ 457)

بڑے بڑے محل تعمیر کرتے رہو گے
گویا تمھیں ہمیشہ رہنا ہے؟"

علامت، نشانی، یادگار کے بنیادی مفہوم سے آگے بڑھ کر قرآن نے اِسے اپنی ایک اصطلاح کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ اِس اعتبار سے یہ لفظ انفس و آفاق کے اُن دلائل کے لیے استعمال ہوا ہے، جو اللہ پروردگارِ عالم کی صفاتِ عالیہ کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ صفات اللہ کی عظمت، خلقت، قدرت، رحمت، ربوبیت، عدالت اور علم و حکمت سے عبارت ہیں۔ انسان کی عقل و فطرت اِن کے شعور کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ اگر اِسے درست طریقے سے استعمال کرے تو اللہ کی معرفت کی راہ تک پہنچ سکتا ہے۔ انسان کی جو صلاحیتیں اِس معاملے میں اُس کی رہنمائی کرتی ہیں، وہ غور و فکر، عقل و ادراک اور ذکر و تذکیر ہیں۔ قرآنِ مجید نے اِنھیں 'يَتَفَكَّرُوْنَ'، 'يَعْقِلُوْنَ' اور 'يَذَّكَّرُوْنَ' سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ. هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ. يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ.

"(اُس کو پانا چاہتے ہو تو جان لو کہ) اللہ تک سیدھی راہ پہنچاتی ہے، جب کہ راہیں ٹیڑھی بھی ہیں۔ اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو اُسی ایک راہ کی ہدایت دے دیتا۔ وہی ہے، جس نے آسمان سے پانی اتارا، جس سے تم پیتے بھی ہو اور اُسی سے وہ نباتات بھی اگتی ہیں، جن میں تم مویشیوں کو چراتے ہو۔ وہ تمھارے لیے اُسی سے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ یقیناً اِس میں اُن لوگوں کے لیے بہت بڑی نشانی ہے، جو غور کریں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ.

رات اور دن اور سورج اور چاند کو اُسی نے تمھارے کام میں لگا رکھا ہے اور اُسی کے حکم سے ستارے بھی تمھارے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ یقیناً اِس میں اُن لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں، جو عقل سے کام لیں۔

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ. (النحل 16: 9-13)

اور یہ جو رنگ رنگ کی چیزیں اُس نے تمھارے لیے زمین میں بکھیر دی ہیں، اُن میں بھی یقیناً بہت بڑی نشانی ہے، اُن لوگوں کے لیے جو یاددہانی حاصل کریں۔"

اِس سے واضح ہے کہ اللہ کی نشانیاں اُس کی ذات و صفات کی معرفت کے لیے ایک وسیلے کا کردار ادا کرتی ہیں۔ گویا صفاتِ الٰہی اور آیاتِ الٰہی کے مابین علت و معلول اور سبب اور مسبب کا تعلق ہے۔ صفات کا مظہر آیات ہیں اور آیات کو دیکھ کر صفات کو پہچانا جا سکتا ہے۔ استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی نے اپنی کتاب "میزان" میں جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں قرآنِ مجید کے موقف کو بیان کیا ہے، وہاں صفات اور آیات کے باہمی تعلق کو بھی واضح کیا ہے۔ اِس بیان کے چند متعلقہ اجزا درج ذیل ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ وہ کسی طرح انسان کے حیطۂ ادراک میں نہیں آ سکتی۔ اِس لیے کہ ادراک کے ذرائع جس ہستی نے پیدا کیے ہیں، وہ تو یقیناً اُنھیں پا سکتی اور اُن کا احاطہ بھی کر سکتی ہے، لیکن یہ ذرائع کسی طرح اُس کا احاطہ نہیں کر سکتے، جو خود اُن کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔...

اللہ تعالیٰ کی صفات، البتہ کسی نہ کسی درجے میں انسان کی گرفت میں آتی ہیں۔ اِس کی

وجہ یہ ہے کہ صفات سے متعلق کچھ چیزیں، خواہ وہ کتنی ہی حقیر ہوں، انسان کے پاس بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم و خبر، قدرت، ربوبیت اور رحمت و حکمت سے کچھ حصہ ہمیں بھی عطا فرمایا ہے۔ اِس پر قیاس کر کے خدا کی اِن صفات کا کچھ تصور ہم قائم کر سکتے ہیں۔ ... تاہم اِس کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی عقل کو بیدار رکھے اور وحی الٰہی کی رہنمائی میں انفس و آفاق کے اندر خدا کی آیات پر غور کرتا رہے۔ قرآن نے اپنے مخاطبین کو اِسی بنا پر بار بار تعقل، تفکر اور تذکر کی دعوت دی ہے ... اِس طریقے سے غور کیا جائے تو انفس و آفاق کی ہر چیز گواہی دیتی ہے کہ خدا محض علت العلل اور واجب الوجود نہیں ہے کہ جس سے سلسلۂ علت و معلول شروع ہوا اور جو ہر حال میں تھا اور ہے اور رہے گا، بلکہ ایک ایسی صاحبِ ارادہ و ادراک ہستی ہے، جو تمام اعلیٰ صفات کی حامل ہے۔"(96-99)

اِس تفصیل سے واضح ہے کہ 'آیۃ' کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کی نسبت سے بیان ہو تو اُس سے مراد انفس و آفاق کی وہ نشانیاں ہوتی ہیں، جو اُس کی مختلف صفات کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ یہ اِس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ وہ خالق کائنات ہے، مالکِ ارض و سما ہے اور مشرق و مغرب کا رب ہے۔ لطیف و خبیر ہے، سمیع و بصیر ہے، رؤف و رحیم ہے، عزیز و حکیم ہے، بکل شیء علیم اور علیٰ کل شیء قدیر ہے۔ چنانچہ جب قرآنِ مجید انسانوں کو اِن صفات کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے تو وہ اِنھی آیاتِ بینات کو بہ طورِ دلیل پیش کرتا ہے اور اِس طرح اُن کے لیے تذکیر و ترغیب، تہدید و تخویف اور تنبیہ و تعذیب کا سامان کرتا ہے۔

انفس و آفاق کی یہ نشانیاں ہر لحاظ سے واضح اور نمایاں ہیں۔ دیکھنے والی آنکھیں اِنھیں دیکھ سکتی، عقل والے دماغ اِنھیں سمجھ سکتے اور بصیرت والے دل اِن سے خالق کی معرفت حاصل کر سکتے اور انجام سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود اگر وہ اِن کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں تو اللہ تعالیٰ نے مزید اہتمام کرتے ہوئے اِنھیں اپنی کتاب میں بالتفصیل بیان کر دیا ہے تاکہ ابہام و اشکال کی کوئی گنجایش باقی نہ رہ جائے۔ ارشاد ہے:

...يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ. "...وہ اُن لوگوں کے لیے جو جاننا

(یونس 5:10) چاہیں، اپنی نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے۔“

...یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ بِلِقَآءِ رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ. (الرعد 2:13)

”...وہ اپنی اِن نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے، اِس لیے کہ تم اپنے پروردگار کی ملاقات کا یقین کرو۔“

استاذِ گرامی سورۂ رعد کی اِس آیت کی شرح میں لکھتے ہیں:

”یعنی اپنی کتاب میں اِن (نشانیوں) کی تفصیل کرتا ہے تاکہ جن حقائق پر یہ دلالت کر رہی ہیں، تم اُن کو سمجھو اور اِس کے نتیجے میں کائنات کی اِس عظیم حقیقت کا یقین حاصل کرلو کہ جس نے اپنی بے پایاں قدرت اور کمال حکمت کے ساتھ یہ دنیا بنائی ہے، وہ اِسے اتمام و تکمیل تک پہنچائے بغیر یوں ہی ختم نہیں ہونے دے گا، بلکہ لازماً اُس منزل تک لے جائے گا، جو اِس کے لیے مقرر ہے۔“(البیان 2/ 573)

درجِ بالا تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ 'آیۃ' کے لغوی معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔ اِس سے مراد وہ ظاہری شے ہے، جو کسی مخفی شے یا حقیقت کی نشان دہی کرے۔ جیسا کہ مثال کے طور پر تخلیق خالق کی، مصنوع صانع کی اور تصویر مصور کی نشان دہی کرتی ہے۔ قرآنِ مجید کی اصطلاح میں اِس سے مراد انفس و آفاق کے وہ دلائل و براہین ہیں، جو اللہ کی ذات و صفات کے عرفان کی منزل تک پہنچنے کے لیے نشاناتِ راہ کا کردار ادا کرتے ہیں اور انسان کو اُس کے اخروی انجام سے باخبر کرتے ہیں۔

اِس اصطلاحی مفہوم میں اِس لفظ کے چار مختلف اطلاقات متعین ہوتے ہیں:

1۔ انفس و آفاق میں معمول کے مطابق ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی

2۔ انفس و آفاق میں معمول کے خلاف ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی

3۔ انفس و آفاق میں نبیوں کے ہاتھوں پر ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی

4۔ انفس و آفاق میں ظاہر ہونے والی جملہ آیاتِ الٰہی کو بیان کرنے والی آیاتِ قرآنی

آیئے، اِن چاروں اطلاقات کو قرآنِ مجید کی روشنی میں قدرے تفصیل سے سمجھتے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں اِس امر کو جاننا آسان ہو جائے گا کہ شق القمر کے واقعے کو اِن میں سے کس کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔

—1—

انفس و آفاق میں
معمول کے مطابق ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی

قرآنِ مجید میں بیش تر مقامات پر ’آیۃ‘ کا لفظ اللہ کی اُن نشانیوں کے لیے استعمال ہوا ہے، جو انفس و آفاق میں ظاہر و باہر ہیں اور جن کا تعلق اللہ کی قدرت کے عادی امور سے ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے بلاشبہ، یہ غیر معمولی ہیں، لیکن عام، مسلسل اور مستقل ظہور کے باعث یہ معمول کے واقعات اور مشاہدات کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً یہ لوگوں کے لیے حیرت و استعجاب یا غور و فکر کا باعث نہیں بنتیں۔ تاہم، چونکہ یہ قطعی، واضح، معلوم و معروف اور ناقابلِ تردید ہوتی ہیں، اِس لیے قرآنِ مجید اِن کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اِن کی بنا پر لوگوں کو اعترافِ حق کی دعوت دیتا ہے۔ کائنات میں ہر سو آشکارا یہ آیاتِ الٰہی قرآن میں جا بہ جا مذکور ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ کا مردہ زمین سے لہلہاتے کھیت پیدا کرنا، انسان کو مٹی کے خمیر سے تخلیق کرنا، اُسی کی جنس سے اُس کا جوڑا بنانا اور پھر دونوں کے درمیان محبت اور سازگاری پیدا کرنا، آسمانوں اور زمین کو تخلیق کر کے اُن میں موافقت قائم کرنا، آسمانوں کو ستونوں کے بغیر کھڑا کرنا، سورج اور چاند کو ایک قانون کا

پابند کرنا، زمین کو بچھانا اور اُس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑنا، لوگوں کے اندر باہمی شناخت کے لیے رنگ و نسل اور زبانوں کا اختلاف رکھنا، آرام کے لیے رات اور کام کے لیے دن تخلیق کرنا، آسمانی بجلیوں سے خوف اور امید کی کیفیت میں مبتلا کرنا اور آسمان سے پانی برسا کر مردہ زمین کے اندر زندگی پیدا کر دینا اِسی نوعیت کی آیاتِ بینات کی مختلف صورتیں ہیں۔

سورۂ روم (30) میں آیات 19 تا 25 ایسا مقام ہے، جہاں اِس نوعیت کی متعدد آیات سے استشہاد اور استدلال کیا گیا ہے۔ اِس مقام پر 'وَمِنْ اٰيٰتِهٖ' (اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے) کے الفاظ کو بار بار دہرا کر اُن عظیم نشانیوں کی طرف متوجہ کیا ہے، جنھیں انسان محض اِس وجہ سے نظر انداز کر دیتا ہے کہ وہ اُس کے لیے معمول کا مشاہدہ اور روزمرہ کا تجربہ بن جاتی ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ. وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ.

”(تمھیں تعجب ہے کہ یہ کس طرح ہو گا؟ دیکھتے نہیں ہو کہ) وہ زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے اور زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندہ و شاداب کر دیتا ہے۔ اِسی طرح تم بھی نکالے جاؤ گے۔ اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر دیکھتے دیکھتے تم انسان بن کر (زمین میں) پھیل جاتے ہو۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم

يَّتَفَكَّرُوْنَ.

اُن کے پاس سکون حاصل کرو اور اِس کے لیے اُس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ اِس میں، یقیناً ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، جو غور کرنے والے ہیں۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ.

زمین اور آسمانوں کی پیدایش اور تمھاری بولیوں اور رنگوں کا اختلاف بھی اُس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اِس میں، یقیناً علم والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ.

اِسی طرح تمھارا رات اور دن میں سونا اور اُس کا فضل تلاش کرنا بھی اُس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اِس میں، یقیناً اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، جو (دل کے کانوں سے) سنتے ہیں۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ.

اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ تمھیں بجلیاں دکھاتا ہے، جو خوف بھی پیدا کرتی ہیں اور امید بھی، اور آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اُس سے زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ اِس میں، یقیناً اُن

لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں،
جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِہٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاکُمْ دَعْوَۃً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ.

(الروم 30:19-25)

اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ زمین و آسمان اُسی کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جب وہ زمین سے نکلنے کے لیے تم کو ایک ہی بار پکارے گا تو سنتے ہی نکل پڑو گے۔"

اِس مقام پر جن نشانیوں کا ذکر آیا ہے، اُن کا مختصر تذکرہ درجِ ذیل ہے۔ اِس سے لفظِ 'آیۃ' کے مفہوم کے مذکورہ بالا اطلاق کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

1۔ انسان کی تخلیق اور نشوونما

اِن میں پہلی آیت یا نشانی انسان کی خلقت اور اُس کی افزایش نسل کو بتایا ہے۔ فرمایا ہے: "اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر دیکھتے دیکھتے تم انسان بن کر پھیل جاتے ہو۔" مطلب یہ ہے کہ اگر انسان اپنی تخلیق پر غور کرے تو اُسے صاف معلوم ہو گا کہ اِس کا وجود مٹی میں پائے جانے والے بے جان عناصر سے تشکیل پایا ہے۔ اللہ نے اِن مردہ ذرات کو زندہ خلیوں میں تبدیل کیا اور پھر اُن کے اندر روح پھونک کر جیتا جاگتا باشعور انسان بنا دیا۔ اور فقط اُسے ہی نہیں بنایا، بلکہ اُس کے وجود کو سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں انسانوں کو ظہور میں لانے کا ذریعہ بھی بنا دیا۔

امام امین احسن اصلاحی اِس نشانی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یعنی تم کو جن حقائق کے ماننے کی دعوت دی جا رہی ہے، وہ تمام تر تمھارے خالق کی قدرت و حکمت پر مبنی ہیں تو اُس کی قدرت و حکمت کے ثبوت کے لیے تم کسی خارجی دلیل

کا مطالبہ کیوں کرتے ہو؟ اِس کی سب سے بڑی دلیل تو خود تمھاری خلقت ہی کے اندر موجود ہے۔ اُس نے تم کو جامد مٹی سے پیدا کیا اور پھر تم زندہ اور عقل و شعور رکھنے والی ہستی بن کر تمام روے زمین پر پھیل گئے۔ ... یعنی غور کرو، کہاں خشک مٹی اور کہاں جیتا جاگتا انسان، دیکھتے دیکھتے خدا کی قدرت نے اِسی مٹی سے ایک پورا جہان آباد کر دیا!"

(تدبر قرآن 6/84-85)

2۔ انسان کی جنس سے اُس کے جوڑے کی تشکیل

دوسری نشانی یہ بیان ہوئی ہے کہ اللہ نے انسان کو جوڑے کی صورت میں تخلیق کیا ہے اور اِس کے دونوں اجزا میں باہم محبت و مودت پیدا کی ہے۔ اِس کے لیے 'خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً' (اُس نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم اُن کے پاس سکون حاصل کرو اور اِس کے لیے اُس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی) کے الفاظ آئے ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ہی ساخت پر پیدا نہیں کیا، بلکہ اِسے مرد و عورت کی دو مختلف ساختوں پر پیدا کیا ہے۔ دونوں اپنی روح اور نفس کے لحاظ سے یکساں ہیں، مگر اپنے اعضا و جوارح اور عملی خصائص کے اعتبار سے مختلف اور متنوع پہلوؤں کے حامل ہیں۔ اِس صنفی اختلاف کے باوجود اُن کی ضرورتیں ایک دوسرے سے وابستہ کی ہیں اور آپس میں انس و محبت اور رحم و کرم کے جذبات پیدا کیے ہیں۔ پھر اِن کی توسیع سے خاندان اور معاشرے کو وجود بخشا ہے۔

استاذِ گرامی اِس نشانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"یعنی انسان کی صرف ایک صنف نہیں بنائی، بلکہ اُسے دو صنفوں کی صورت میں پیدا کیا اور دونوں کے اندر الگ الگ انفرادی خصوصیات رکھیں، لیکن پھر اُن میں ایسی مناسبت پیدا کر دی کہ دونوں ایک دوسرے سے تسکین و راحت حاصل کرتے ہیں، جس کے لیے

محبت و رحمت کا ایسا جذبہ اُن کے اندر ودیعت کر دیا کہ اُنھیں وہ ایک دوسرے کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے کا خیر خواہ، ہم درد و غم خوار اور شریکِ رنج وراحت بنا دیتا ہے۔" (البیان 4 / 52)

امام امین احسن اصلاحی نے اِس آیت کو چار مختلف نشانیوں کے طور پر واضح کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اِس کے اندر ایک واضح نشانی تو اِس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس کائنات میں ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی ہے اور ہر چیز اپنے مقصدِ وجود کی تکمیل اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر کرتی ہے۔ اِس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اِس دنیا کا بھی ایک جوڑا ہے، جس کو آخرت کہتے ہیں۔ اِسی آخرت سے اِس دنیا کی غایت کی تکمیل ہوتی ہے۔ دوسری نشانی اِس کے اندر یہ ہے کہ ہمارا خالق نہایت مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔ اُس نے ہمارے اندر جوڑے کی طلب دی تو ہماری ہی جنس سے ہمارا جوڑا بھی اُس نے پیدا کیا اور پھر دونوں کے اندر محبت و ہم دردی کے جذبات بھی ودیعت فرمائے تاکہ دونوں دو قالب یک جان ہو کر زندگی بسر کریں۔ تیسری نشانی اِس کے اندر یہ ہے کہ اِس کائنات کے اضداد کے اندر نہایت گہرا توافق اور ایک بالاتر مقصد کے لیے نہایت عمیق سازگاری پائی جاتی ہے، جو اِس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اِس کا خالق و مالک ایک ہی ہے، جو اپنی حکمت کے تحت اِس کائنات کے اضداد میں توفیق پیدا کرتا ہے۔ چوتھی نشانی اِس کے اندر یہ ہے کہ اِن لوگوں کا خیال بالکل احمقانہ ہے، جو سمجھتے ہیں کہ اِس کائنات کا ارتقا آپ سے آپ ہوا ہے۔ اگر اِس کا ارتقا آپ سے آپ ہوا ہے تو اِس کے اضداد میں یہ حیرت انگیز توافق کہاں سے پیدا ہوا؟ یہ تو اِس بات کی صاف شہادت ہے کہ ایک قادر و حکیم ہستی ہے، جو اِس پورے نظام کو اپنی حکمت کے تحت چلا رہی ہے۔" (تدبر قرآن 6 / 85)

3۔ زمین اور آسمانوں کی تخلیق

زمین اور آسمانوں کی پیدایش اور انسانوں کی زبانوں اور رنگوں کے اختلاف کو بھی اللہ کی

نشانیاں قرار دیا ہے۔ اِس کے لیے 'خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی زمین اور آسمانوں کی تخلیق بھی اُس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اِس میں علم والوں کے لیے، یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔ مراد یہ ہے کہ انسان کی تخلیق کی طرح کائنات کی تخلیق بھی اللہ کی معرفت کی عظیم نشانی ہے۔ یعنی جب وہ سر جھکا کر اپنے وجود پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے یہ محدود سا وجود اللہ کی کرشمہ سازیوں کا مظہر دکھائی دیتا ہے اور جب وہ سر اٹھا کر اپنے گردوپیش کا نظارہ کرنا چاہتا اور آسمان کی وسعتوں پر نظر ڈالتا ہے تو اُس کی نظر تھک کر واپس لوٹ آتی ہے۔ اُسے اندازہ ہوتا ہے کہ زمین کے دفینے اور آسمان کی وسعتیں اُس کے شعور سے بلند اور تصورات سے ماوراہیں۔ امام امین احسن اصلاحی آسمانوں اور زمین کی نشانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "اگر لوگ غور کریں تو اُن کو یہ چیز صاف نظر آئے گی کہ اِس کائنات میں کثرت کے اندر وحدت مضمر ہے۔ ایک طرف آسمانوں کی ایک وسیع اور ناپیدا کنار کائنات ہے اور دوسری طرف یہ کرۂ زمین ہے۔ بہ ظاہر دونوں میں کتنی دوری ہے، لیکن اِس دوری کے باوجود دونوں میں اتنا گہرا اتصال ہے کہ کوئی عاقل یہ تصور نہیں کر سکتا کہ دونوں الگ الگ خالقوں کی قدرت سے وجود میں آئے اور الگ الگ ارادوں کے تحت گردش کر رہے ہیں، بلکہ اِن کی باہمی سازگاری پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ ایک ہی قدیر و حکیم دونوں پر متصرف ہے اور دونوں کو ایک مشترک مقصد کے لیے مسخر کیے ہوئے ہے۔"
>
> (تدبر قرآن 6/86)

4۔ انسانوں کی زبانوں اور رنگوں میں اختلاف

انسانوں کی بولیوں اور رنگ و نسل کا اختلاف بھی اللہ کی ایک عظیم نشانی ہے۔ یہ اختلاف جہاں پہچان اور تعارف کا فائدہ دیتا ہے، وہاں امتحان اور آزمایش کی مختلف صورتوں کا باعث بھی بنتا ہے۔ صاحبِ "تفہیم القرآن" مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے زبان و رنگ کے اختلاف

کی نشانی کو بہت وضاحت سے سمجھایا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یعنی باوجودیکہ تمھارے قوائے نطقیہ یکساں ہیں، نہ منہ اور زبان کی ساخت میں کوئی فرق ہے اور نہ دماغ کی ساخت میں، مگر زمین کے مختلف خطوں میں تمھاری زبانیں مختلف ہیں، پھر ایک ہی زبان بولنے والے علاقوں میں شہر شہر اور بستی بستی کی بولیاں مختلف ہیں، اور مزید یہ کہ ہر شخص کا لہجہ اور تلفظ اور طرزِ گفتگو دوسرے سے مختلف ہے، اِسی طرح تمھارا مادۂ تخلیق اور تمھاری بناوٹ کا فارمولا ایک ہی ہے، مگر تمھارے رنگ اِس قدر مختلف ہیں کہ قوم اور قوم تو درکنار، ایک ماں باپ کے دو بیٹوں کا رنگ بھی بالکل یکساں نہیں ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف دو ہی چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ لیکن اِسی رخ پر آگے بڑھ کر دیکھیے تو دنیا میں آپ ہر طرف اتنا تنوع (Variety) پائیں گے کہ اِس کا احاطہ مشکل ہو جائے گا۔ انسان، حیوان، نباتات اور دوسری تمام اشیا کی جس نوع کو بھی آپ لے لیں، اُس کے افراد میں بنیادی یکسانی کے باوجود بے شمار اختلافات موجود ہیں، حتیٰ کہ کسی نوع کا بھی کوئی ایک فرد دوسرے سے بالکل مشابہ نہیں ہے، حتیٰ کہ ایک درخت کے دو پتوں میں بھی پوری مشابہت نہیں پائی جاتی۔ یہ چیز صاف بتا رہی ہے کہ یہ دنیا کوئی ایسا کارخانہ نہیں ہے، جس میں خود کار مشینیں چل رہی ہوں اور کثیر پیدا آوری (Mass Production) کے طریقے پر ہر قسم کی اشیا کا بس ایک ایک ٹھپہ ہو، جس سے ڈھل ڈھل کر ایک ہی طرح کی چیزیں نکلتی چلی آ رہی ہوں۔ بلکہ یہاں ایک ایسا زبردست کاری گر کام کر رہا ہے، جو ہر چیز کو پوری انفرادی توجہ کے ساتھ ایک نئے ڈیزائن، نئے نقش و نگار، نئے تناسب اور نئے اوصاف کے ساتھ بناتا ہے اور اُس کی بنائی ہوئی ہر چیز اپنی جگہ منفرد ہے۔ اُس کی قوتِ ایجاد ہر آن، ہر چیز کا ایک نیا ماڈل نکال رہی ہے، اور اُس کی صناعی ایک ڈیزائن کو دوسری مرتبہ دوہرانا اپنے کمال کی توہین سمجھتی ہے۔ اِس حیرت انگیز منظر کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر دیکھے گا، وہ کبھی اِس احمقانہ تصور میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ اِس کائنات کا بنانے والا ایک دفعہ اِس کارخانے کو چلا کر کہیں جا سویا ہے۔ یہ تو اِس بات

کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ ہر وقت کارِ تخلیق میں لگا ہوا ہے اور اپنی خلق کی ایک ایک چیز پر انفرادی توجہ صرف کر رہا ہے۔“ (تفہیم القرآن 3/ 746-747)

5۔ گردشِ لیل و نہار

رات اور دن کے آنے جانے کو بھی آیات میں شمار کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: ”اِسی طرح تمھارا رات اور دن میں سونا اور اُس کا فضل تلاش کرنا بھی اُس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اِس میں، یقیناً اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، جو (دل کے کانوں سے) سنتے ہیں۔“ لیل و نہار کی آمد و شد، بہ ظاہر نہایت معمول کا واقعہ ہے، مگر اِس کے اندر پروردگار کے غیر معمولی علم و حکمت اور ربوبیت کی حقیقت پوری طرح آشکار ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ جو وجود اُس نے تخلیق کیا ہے، اُس کو ذہنی، روحانی اور جسمانی آرام کی ضرورت ہے۔ اِس کے بغیر وہ زیادہ دیر تک کارکردگی کے قابل نہیں رہتا۔ پھر ماحول کی یکساں اور مستقل کیفیت زندگی کی سرگرمی کو بے کیف بنا دیتی ہے۔ انسان کی اِس ڈھب پر تخلیق کا تقاضا ہے کہ اُس کے رہنے کے لیے تیار کی گئی سکونت گاہ اِس رنگ ڈھنگ کے مطابق ہو۔ یعنی خالق اگر علیم و حکیم ہے تو وہ مخلوق کی ضرورتوں سے کما حقہٗ آگاہ ہو گا اور کمال ربوبیت سے اُن کی تکمیل کا اہتمام بھی کرے گا۔ یہ ضرورت اور اِس کی تکمیل کے اسباب دلیل ہیں کہ انسان اور کائنات اتفاقاً وجود میں نہیں آ گئے، بلکہ اِنھیں ایک نہایت علیم و حکیم ہستی نے تخلیق کیا ہے۔

استاذِ گرامی اِس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”فرمایا کہ وہ اگر تنہا اِسی بات پر غور کریں کہ اُن کے خالق نے انسانی جسم کے لیے نیند اور آرام کی ضرورت اور معاش کی جد و جہد کو رات اور دن میں تقسیم کر کے کس رحمت و شفقت کے ساتھ اُنھیں اور اُن کے ماحول کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔ کیا یہ چیز صاف صاف ایک رب رحیم و کریم کے وجود کا پتا نہیں دے رہی؟ کیا اِس کے بعد بھی انسان کہہ سکتا ہے

کہ یہ سب کچھ اتفاقاً ہو گیا ہے یا اِس میں ایک سے زیادہ خداؤں کی خدائی متصور ہو سکتی ہے یا اِس کائنات کا خالق اِسے یوں ہی ختم ہو جانے دے گا؟ اِس میں، اگر غور کیجیے تو مخالفین کے رویے پر ایک نوعیت کی تعریض بھی ہے کہ سنتے بھی ہیں تو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اندھے اور بہرے ہو کر مخالفت کے لیے آستینیں چڑھا لیتے ہیں۔"

(البیان 4/54-55)

سورۂ یونس میں اِس نشانی کو کائنات کے انجام کی ایک علامت کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ.(6:10)

"یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور جو کچھ زمین اور آسمانوں میں اللہ نے پیدا کیا ہے، اُس میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں، جو ڈرتے ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ ایام کی گردش اِس امر کی نشانی ہے کہ کائنات ایک عظیم نتیجے تک پہنچنے والی ہے، یہ بے مقصد ہر گز نہیں ہے۔ امام امین احسن اصلاحی نے بیان کیا ہے:

"اختلافِ لیل و نہار سے اُس تعاقب کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے، جو وہ ایک دوسرے کا پوری سرگرمی سے کر رہے ہیں، جس سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ یہ گردش بے غایت و بے مقصد نہیں ہے، بلکہ ایک عظیم نتیجہ پر منتہی ہونے والی ہے۔ دوسرے، اِس عظیم نظام ربوبیت کی طرف بھی اِس میں اشارہ ہے، جو رات اور دن کے اختلافِ مزاج کے اندر مضمر ہے کہ دن انسان کے لیے معاش و معیشت کی سرگرمیوں کا میدان گرم کرتا ہے اور رات اُس کے لیے راحت و سکون کا بستر بچھاتی ہے۔ اِس نظام پر جو شخص بھی غور کرتا ہے، وہ لازماً اِس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ اضداد کے اندر ایک مشترک مقصد کے لیے یہ حیرت انگیز توافق اُسی شکل میں وجود میں آسکتا ہے، جب یہ مانا جائے کہ یہ سارا کارخانہ صرف ایک قادر و قیوم کے ارادے کے تحت کام کر رہا ہے اور پھر اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ

جس نے ربوبیت و پرورش کا یہ سارا نظام کھڑا کیا ہے اور اُس کو اِس اہتمام سے چلا رہا ہے، وہ انسان کو مطلق العنان اور غیر مسئول نہیں چھوڑے گا، بلکہ اِس کے بعد ایک ایسا دن لازماً آنا ہے، جس میں وہ اِس ربوبیت کا حق پہچاننے والوں کو اُن کی حق شناسی کا انعام دے گا اور اِس سے بے پروا رہنے والوں کو جہنم میں جھونک دے گا۔ یہی نتیجہ اِس کائنات کے تمام اجزا اور اِس کے تمام اضداد پر غور کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور یہی حاصل ہے، جو انسان کی رہنمائی آخرت اور اِس جزا و سزا کی طرف کرتا ہے۔'' (تدبر قرآن 4/ 26)

6۔ بادلوں کی گرج چمک اور برسات

آسمان کے مختلف مظاہر بھی اللہ کی نشانیوں کے عکاس ہیں۔ بجلی چمک کر بارش کی خبر دیتی ہے۔ یہ بارش کسی بستی کے لیے رحمت کی برسات بنتی اور کسی بستی میں عذاب کا طوفان لے کر آتی ہے۔ اِس طرح بہ یک وقت آس اور امید اور خوف و ہراس کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ ایک ہی چیز ہے، جس کو پروردگار چاہے تو انعام کی صورت دے دے اور چاہے تو سزا بنا دے۔

استاذِ گرامی لکھتے ہیں:

''یعنی (یہ بجلیاں) اپنے وجود سے تعلیم دیتی ہیں کہ نعمت و نقمت، سب خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ جزا و سزا، دونوں پر پورا اختیار رکھتا ہے اور اُس کے لیے اپنی جس نعمت کو چاہے، نقمت اور نقمت کو نعمت میں تبدیل کر سکتا ہے۔'' (البیان 4/ 55)

یہی معاملہ بارش کا ہے۔ وہ رحمت اور بخشش کا باعث بھی بنتی ہے اور قہر اور غضب کا بھی۔ اِس کا فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ کب اُسے کھیتوں کھلیانوں کی آب یاری کا حکم دیتا ہے اور کب کھڑی فصلوں کو بہا لے جانے کا فرمان جاری کرتا ہے۔ یہاں بارش کے حوالے سے 'فَيُحۡىٖ بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا' (پھر اُس سے زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد

زندہ کر دیتا ہے۔) کے الفاظ آئے ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”یہ چیز ایک طرف حیات بعد الموت کی نشان دہی کرتی ہے، اور دوسری طرف یہی چیز اِس امر پر بھی دلالت کرتی ہے کہ خدا ہے، اور زمین و آسمان کی تدبیر کرنے والا ایک ہی خدا ہے۔ زمین کی بے شمار مخلوقات کے رزق کا انحصار اُس پیداوار پر ہے، جو زمین سے نکلتی ہے۔ اُس پیداوار کا انحصار زمین کی صلاحیتِ بار آوری پر ہے۔ اِس صلاحیت کے روبکار آنے کا انحصار بارش پر ہے، خواہ وہ براہِ راست زمین پر برسے، یا اُس کے ذخیرے سطح زمین پر جمع ہوں، یا زیرِ زمین چشموں اور کنوؤں کی شکل اختیار کریں، یا پہاڑوں پر یخ بستہ ہو کر دریاؤں کی شکل میں بہیں۔ پھر اِس بارش کا انحصار سورج کی گرمی پر، موسموں کے ردوبدل پر، فضائی حرارت و برودت پر، ہواؤں کی گردش پر، اور اُس بجلی پر ہے، جو بادلوں سے بارش برسنے کی محرک بھی ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بارش کے پانی میں ایک طرح کی قدرتی کھاد بھی شامل کر دیتی ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک کی اِن تمام مختلف چیزوں کے درمیان یہ ربط اور مناسبتیں قائم ہونا، پھر اِن سب کا بے شمار مختلف النوع مقاصد اور مصلحتوں کے لیے صریحاً ساز گار ہونا، اور ہزاروں لاکھوں برس تک اِن کا پوری ہم آہنگی کے ساتھ مسلسل ساز گاری کرتے چلے جانا، کیا یہ سب کچھ محض اتفاقاً ہو سکتا ہے؟ کیا یہ کسی صانع کی حکمت اور اُس کے سوچے سمجھے منصوبے اور اُس کی غالب تدبیر کے بغیر ہو گیا ہے؟ اور کیا یہ اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ زمین، سورج، ہوا، پانی، حرارت، برودت، اور زمین کی مخلوقات کا خالق اور رب ایک ہی ہے؟“ (تفہیم القرآن 3/ 748-749)

7۔ زمین و آسمان کا قیام و دوام

زمین و آسمان کا قیام و استحکام بھی آیاتِ الٰہی میں سے ہے۔ یہ اللہ کے حکم سے قائم و دائم ہیں۔ اُس کا حکم ہو گا تو اِن کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ پھر جب وہ انسانوں کو زمین سے نکلنے کا

حکم دے گا تو انسانوں کے پاس سرتابی کی کوئی گنجایش نہیں ہو گی۔ اُن کا وجود آپ سے آپ اُس کی آواز پر لبیک کہہ اٹھے گا۔ نہ آسمان پروردگار کی ندا کو انسانوں تک پہنچنے سے روک پائے گا اور نہ زمین اپنے اندر سے اُن کے نکلنے پر رکاوٹ ڈال سکے گی۔

'تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ' (زمین و آسمان اُسی کے حکم سے قائم ہیں) کے حوالے سے استاذِ گرامی لکھتے ہیں:

> "اِس کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے، اِس لیے کہ تم اگر سن سکو تو اتھاہ خلاؤں میں گردش کرتے ہوئے نجوم و کواکب اور سورج اور چاند اور تمھاری یہ زمین، سب بول کر بتا رہے ہیں کہ وہ کسی قائم رکھنے والے کی قدرت سے قائم ہیں اور کسی چلانے والے کے زور سے چل رہے ہیں۔" (البیان 4/ 55)

'ثُمَّ اِذَا دَعَاکُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ' (پھر جب وہ زمین سے نکلنے کے لیے تم کو ایک ہی بار پکارے گا تو سنتے ہی نکل پڑو گے) کے ٹکڑے پر استاذِ گرامی کا حاشیہ ہے:

> "یعنی دوسری مرتبہ پکارنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔ زمین و آسمان کے قیام و استحکام میں خدا کی قدرت و حکمت کا اظہار جس حیرت انگیز طریقے سے اور جس اعلیٰ سطح پر دیکھ رہے ہو، وہ یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ وہ اگر ایک ہی پکار پکار دے تو ممکن نہیں ہے کہ زمین اُس کے حکم سے سرتابی کی جسارت کرے یا آسمان اُس سے سرِ مو انحراف کر سکے۔" (البیان 4/ 55-56)

سورۂ روم میں اِس بیان کے خاتمۂ کلام کے طور پر فرمایا ہے کہ فقط مذکورہ اشیا اور معاملات ہی نہیں، بلکہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے، سب پر اللہ کا حکم قائم ہے۔ کوئی واقعہ اُس کے اذن کے بغیر رونما نہیں ہوتا۔ ہر چیز میں، ہر معاملے میں، ہر واقعے میں اُس کی صفات کی نشانیاں نمایاں ہیں، جو انسان کو آگاہ کرتی ہیں کہ وہی ہے، جس نے خلقت کی ابتدا کی ہے اور وہی اِس کا اعادہ کرے گا۔ اِس لیے انسان کو اِس کے دائرۂ قدرت سے فرار کی راہ نہیں ڈھونڈنی چاہیے۔ وہ زبردست بھی ہے اور حکمت والا بھی ہے۔ ارشاد ہے:

وَ لَهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ کُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوۡنَ. وَهُوَ الَّذِیۡ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُهٗ وَ هُوَ اَهۡوَنُ عَلَیۡهِ ؕ وَ لَهُ الۡمَثَلُ الۡاَعۡلٰی فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ وَ هُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ. (الروم30:26-27)

”زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، اُسی کے ہیں، سب اُسی کے فرماں بردار ہیں۔ وہی ہے، جو خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اُسے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ اُس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ زمین اور آسمانوں میں سب سے بالاتر صفت اُسی کی ہے اور وہی عزیز و حکیم ہے۔“

امام امین احسن اصلاحی نے اِس مقام کی تفسیر میں لکھا ہے:

”فرمایا کہ وہی ہے، جو خلق کا آغاز کرتا ہے، پھر وہی اُس کا اعادہ کرے گا اور یہ اعادہ تم سوچو تو اُس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم اِس حقیقت کو تسلیم کرتے ہو کہ اُسی نے خلق کو وجود بخشا ہے تو اُس کے دوبارہ پیدا کیے جانے کو کیوں مستبعد خیال کرتے ہو؟ پہلا کام زیادہ مشکل ہے یا یہ دوسرا؟... فرمایا کہ آسمانوں اور زمین میں تمام اعلیٰ صفتوں کا اصلی حق دار وہی ہے، کوئی دوسرا اُن صفات میں اُس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اِس کے بعد خاص طور پر اپنی دو صفتوں — عزیز و حکیم — کا حوالہ دیا کہ وہ ہر چیز پر غالب، سب سے بالاتر، اور اُس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں، اُس کے ارادے میں اِس کی حکمت کے سوا اور کوئی چیز بھی دخیل نہیں، اور اِس ساری کائنات میں کوئی نہیں، جو اُس کی صفات میں برابری کر سکے۔ اِس سے یہ بات لازمی نتیجہ کے طور پر آپ سے آپ نکل آئی کہ جب صفات میں کوئی اُس کی برابری کا نہیں تو اُس کے حقوق میں بھی کوئی اُس کی برابری کا نہیں قرار دیا جا سکتا۔“

(تدبر قرآن 6/ 89)

—2—

انفس و آفاق میں معمول کے خلاف ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی

قرآنِ مجید میں 'آیۃ' کا لفظ انفس و آفاق کی مافوق الفطرت نشانیوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ اِن سے مراد وہ احوال و واقعات ہیں، جو اللہ کی قدرت کے عظیم الشان مظاہر کے طور پر خلافِ معمول رونما ہوتے ہیں۔ یہ پیغمبر کی وساطت سے نہیں، بلکہ اللہ کے براہِ راست حکم سے یا کارکنانِ قضا و قدر کے ذریعے سے واقع ہوتے ہیں۔ اِن کا ظہور شاذ و نادر اور ناگہاں ہوتا ہے، اِس لیے لوگ اِن کے بارے میں ناواقف اور غیر متوقع ہوتے ہیں۔ عرف و عادت اور عام دستور و قانون کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ حیرت و استعجاب کا باعث بنتے ہیں۔ لوگوں کو اِن کے بارے میں توجہ دلانے کی ضرورت نہیں پڑتی، اِن کی ندرت اور سنسنی خیزی از خود اُنھیں متوجہ کر لیتی ہے۔ اِس طرح کی آیات عام زمانے میں بھی ظاہر ہو سکتی ہیں، مگر زمانۂ نبوت و رسالت میں اِن کا ورود مقابلتاً زیادہ ہوتا ہے۔ اِن کا مقصد تنبیہ و تذکیر بھی ہوتا ہے، انعام و اکرام بھی اور تکلیف و تعذیب بھی۔ ہر صورت میں یہ اِس طور سے ظاہر ہوتی ہیں کہ نہ اِنھیں معمول کا واقعہ سمجھ کر نظر انداز کیا جا سکتا اور نہ اتفاقی حادثہ قرار دے کر فراموش

کیا جا سکتا ہے۔

قرآنِ مجید میں اِس نوعیت کی جن آیات کا ذکر ہوا ہے، اُن میں سے چند بہ طورِ مثال درج ذیل ہیں۔

1۔ عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ کے پیدایش اور گھوارے میں گفتگو

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے بن باپ کے پیدا ہونا، اِسی طرح کا خارقِ عادت واقعہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے براہِ راست حکم سے عمل میں آیا ہے۔ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے مریم اور ابنِ مریم، دونوں کو آیت قرار دیا ہے۔ سورۂ مومنون میں ارشاد فرمایا ہے:

وَجَعَلۡنَا ابۡنَ مَرۡيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً.... (50:23)

”اور مریم کے بیٹے اور اُس کی ماں کو بھی ہم نے اِسی طرح ایک عظیم نشانی بنایا...۔“

سورۂ انبیاء میں اِن دونوں ہستیوں کو ’اٰيَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ‘ (دنیا والوں کے لیے نشانی) کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَالَّتِىۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا فَنَفَخۡنَا فِيۡهَا مِنۡ رُّوۡحِنَا وَجَعَلۡنٰهَا وَابۡنَهَاۤ اٰيَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ. (91:21)

”اور اُس خاتون پر بھی جس نے اپنا دامن پاک رکھا تو ہم نے اُس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور اُس کو اور اُس کے بیٹے (عیسیٰ) کو دنیا والوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔“

سورۂ مریم میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اُس میں اِس اقدام کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: ’وَلِنَجۡعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحۡمَةً مِّنَّا‘ یعنی مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسیح علیہ

السلام کو لوگوں کے لیے ایک نشانی اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں۔ فرمایا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا. فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۖ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا. قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا.

”(اب) اِس کتاب میں مریم کا ذکر کرو، جب وہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر (بیت المقدس کے) مشرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ اور اپنے آپ کو اُن سے پردے میں کر لیا تھا۔ پھر ہم نے اُس کے پاس اپنا فرشتہ بھیجا اور وہ اُس کے سامنے ایک پورے آدمی کی صورت میں نمودار ہو گیا۔ مریم (نے اُسے دیکھا تو) بول اٹھی کہ میں تم سے خدائے رحمٰن کی پناہ میں آتی ہوں، اگر تم اُس سے ڈرنے والے ہو۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا. قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا.

اُس نے کہا: میں تمھارے پروردگار ہی کا فرستادہ ہوں اور اِس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تمھیں ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں۔ مریم نے کہا: میرے ہاں لڑکا کیسے ہو گا، نہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ میں کبھی بدکار رہی ہوں!

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا.(19:16-21)

اُس نے کہا: اِسی طرح ہو گا۔ تمھارا پروردگار فرماتا ہے کہ یہ میرے لیے بہت آسان ہے۔ ہم یہ اِس لیے کریں گے کہ وہ ہمارا پیغمبر ہو اور اِس لیے کہ

ہم اُس کو لوگوں کے لیے ایک نشانی
اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں۔ اور
یہ بات طے کر دی گئی ہے۔"

اِس تفصیل سے واضح ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی بن باپ کے پیدایش ایک خارقِ عادت واقعہ تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانی کے طور پر ظاہر کیا تھا۔ اِس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدایش کے عام قانون سے ہٹ کر اپنا حکم براہِ راست نازل کیا اور اپنے کلمۂ 'کن' سے بطن مادر میں مولود کا استقرار کیا اور اُس میں اپنی روح پھونک دی۔ یہ اُسی طرح کا حکم تھا، جو اُس نے آدم و حوا کی پیدایش کے لیے نازل کیا تھا۔ یہ نشانی رہتی دنیا تک کے لیے تخلیق انسانی اور اُس کے اعادے کی دلیل کے طور پر نمایاں رہے گی۔ امام امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خارقِ عادت ولادت قیامت کی بہت بڑی نشانی ہے۔ نادانوں کو قیامت پر سب سے بڑا شبہ یہی تو ہوتا ہے کہ آخر اسباب کے بغیر لوگ کس طرح دوبارہ پیدا ہو جائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود اِس شبہ کا جواب ہے کہ ہر چیز اللہ کے کلمۂ 'کن' سے ظہور میں آتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اِسی کلمہ سے وجود میں آئے ہیں۔ چنانچہ اِسی بنیاد پر اُن کو انجیل اور قرآن، دونوں میں 'کلمۃ اللہ' کہا بھی گیا ہے۔"

(تدبر قرآن 4/645)

سیدنا مسیح علیہ السلام کا گھوارے میں کلام کرنا اِسی آیت کا تسلسل ہے۔ سورۂ مریم ہی میں بیان ہوا ہے کہ اللہ کے حکم سے سیدہ مریم کو حمل ٹھہرا اور وہ اِس کے ساتھ اپنے علاقے سے دور چلی گئیں۔ پھر جب ولادت کا موقع آیا تو اُس وقت اللہ کا فرشتہ آیا، جس نے اُنھیں تسلی دی اور اُن کے لیے چشمہ جاری کیا۔ پھر اُنھیں ہدایت کی کہ وہ نومولود کو لے کر اپنی قوم میں واپس جائیں۔ وہ اگر کوئی سوال یا اعتراض کریں تو اشارے سے بتا دیں کہ اُنھوں نے چپ رہنے کا روزہ رکھا ہے۔ چنانچہ وہ واپس گئیں۔ بچے کو ساتھ دیکھ کر لوگوں نے اُن کی پاک دامنی پر تہمت لگانی شروع کی تو اُنھوں نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا کہ ہم اُس

سے کیسے پوچھیں، جو نومولود ہے اور بولنے کی عمر کو نہیں پہنچا؟ اِس پر بچے نے بولنا شروع کر دیا۔ قرآنِ مجید کا بیان ہے:

قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ ؕ۟ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَجَعَلَنِیۡ نَبِیًّا. وَجَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَاکُنۡتُ وَاَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّا. وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیۡ ۫ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡنِیۡ جَبَّارًا شَقِیًّا.

”بچہ بول اٹھا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اُس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے نبی بنایا۔ اور جہاں کہیں بھی ہوں، مجھے سرچشمۂ خیر و برکت ٹھیرایا ہے۔ اُس نے مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں، نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کروں۔ اور مجھے اپنی ماں کا فرماں بردار بنایا ہے، مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔

وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوۡمَ وُلِدۡتُّ وَیَوۡمَ اَمُوۡتُ وَ یَوۡمَ اُبۡعَثُ حَیًّا.(19:30-35)

اور مجھ پر سلامتی (کی بشارت) ہے، جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں گا اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔“

امام امین احسن اصلاحی اِس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جب حضرت مریم علیہا السلام کی آزمایش یہاں تک پہنچ گئی اور وہ ہر مرحلہ میں سو فی صدی کامیاب ثابت ہوئیں تو وقت آ گیا کہ اللہ تعالیٰ اب اپنا اعلان کرا دے کہ وہ اپنے کسی بندے یا بندی کے لیے، جو اُس کے امتحان میں کامیاب ہو جائے، اپنی کیا شانیں دکھاتا ہے۔... حضرت مریم علیہا السلام جس امتحان میں ڈال دی گئی تھیں، اُس سے پوری عزت اور سرخ روئی کے ساتھ عہدہ بر آ ہونے کے لیے ضروری تھا کہ گود کا بچہ ہی اُن کی پاک دامنی اور اپنی وجاہت کی شہادت دے تاکہ کسی کے لیے بھی اُس کے بعد لب کشائی کی

گنجایش باقی نہ رہے۔“(تدبر قرآن 4/647-648)

2۔ بنی اسرائیل پر بدلیوں کے سایے اور من و سلویٰ کی نعمتیں

قرآنِ مجید نے مختلف مقامات پر اُن عظیم الشان انعامات کا ذکر کیا ہے، جو بنی اسرائیل کو عطا کیے گئے۔ اِن میں سے بہت سی نعمتوں کی نوعیت خرقِ عادت کی ہے۔ بعض اُن کے انبیا کے توسط سے اور بعض براہِ راست نازل کی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اِنھیں 'اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ' (واضح نشانیاں) کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ....(2:211)

”بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے اُن کو کتنی واضح نشانیاں دیں، (مگر اِس سے کیا فائدہ ہوا)؟....“

اِن آیاتِ بینات میں سے دو نمایاں آیات یہ ہیں کہ اُن پر بدلیوں کا سایہ کیا گیا اور من و سلویٰ اتارا گیا۔ فرمایا ہے:

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ....(2:57)

”اور تم پر بدلیوں کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارے، کھاؤ یہ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمھیں دی ہیں....“

یہ اصل میں وہ انعامات ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے اُنھیں صحراے سینا میں عطا فرمائے۔ اِس چٹیل صحرا میں نہ اُن کے پاس مکانات تھے، نہ خیمے اور خرگاہیں تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ کھلے آسمان تلے رہ رہے تھے۔ اِس صورتِ حال میں اُنھیں دھوپ کی حدت سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ نے اُن پر بدلیوں کا سایہ کیے رکھا۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

”.. بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نکل کر آئے تھے اور سینا کے علاقے میں مکانات کا تو کیا ذکر، سر چھپانے کے لیے اُن کے پاس خیمے تک نہ تھے۔ اُس زمانے میں

اگر خدا کی طرف سے ایک مدت تک آسمان کو ابر آلود نہ رکھا جاتا تو یہ قوم دھوپ سے ہلاک ہو جاتی۔" (تفہیم القرآن 1 / 77-78)

اللہ نے اُن کی سکونت کے لیے جہاں بادلوں کا سائبان تان دیا، وہاں خوانِ نعمت کے طور پر من و سلویٰ کا اہتمام کیا۔ اِس خوان سے مستفید ہونے کے لیے نہ اُنھیں زمین کو تیار کرنا پڑتا تھا، نہ فصل بونے اور کاٹنے کی مشقت اٹھانی پڑتی تھی اور نہ کھانا تیار کرنے کا تردد کرنا پڑتا تھا۔ اِس خوان کو قرآن نے من و سلویٰ سے تعبیر کیا ہے۔ استاذِ گرامی نے بائیبل کی کتاب خروج کے حوالے سے اِس کے بارے میں لکھا ہے:

"یہ (مَنّ) شبنم کی طرح کی ایک چیز تھی، جو زمین پر ٹپکتی تھی اور پالے کے دانوں کی طرح جم جاتی تھی۔ بنی اسرائیل اِسے سورج کی تمازت بڑھنے سے پہلے جمع کر لیتے تھے۔ تمازت بڑھتے ہی یہ دانے پگھل جاتے تھے۔ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں جہاں غذا کے اسباب مفقود تھے، یہ ایک عظیم نعمت تھی، جو بغیر کوئی مشقت اٹھائے بنی اسرائیل کو خدا کے حکم پر پیغمبر کے ساتھ ہجرت کرنے کے صلے میں حاصل ہوئی۔ 'مَنّ' کے معنی فضل و عنایت کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اِسی مناسبت سے اِس کا نام 'مَنّ' قرار پایا۔

اِس (السَّلْوٰی) سے مراد وہ پرندے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے صحراے سینا میں بنی اسرائیل کے لیے بھیجے، یہ بٹیروں سے ملتے جلتے تھے اور بٹیروں ہی کی طرح نہایت آسانی سے شکار ہو جاتے تھے۔" (البیان 1 / 68-69)

3۔ بنی اسرائیل پر کوہِ طور کا معلق ہونا

اِسی طرح کی ایک اور نشانی وہ ہے، جب اللہ کے حکم پر کوہِ طور بنی اسرائیل کے سروں پر معلق ہو گیا۔ یعنی پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑا اور شامیانے کی طرح اُن کے اوپر لٹکنے لگا۔ یہ غیر معمولی واقعہ اُس وقت رونما ہوا، جب اللہ نے وادیِ سینا میں بنی اسرائیل پر احکام شریعت کی الواح

نازل فرمائیں۔ اُس موقع پر اُن سے عہد لیا گیا کہ وہ تورات کو مضبوطی سے تھامے رکھیں گے اور اُس کے احکام وہدایات پر پوری طرح عمل پیرا رہیں گے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (63:2)

”اور یاد کرو، جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور (اِس کے لیے) طور کو تم پر اٹھایا تھا اور کہا تھا کہ اُس چیز کو پوری قوت کے ساتھ پکڑو، جو ہم نے تمھیں دی ہے، اور جو کچھ اُس میں (لکھا) ہے، اُسے یاد رکھو تاکہ تم (اللہ کے غضب سے) بچے رہو۔“

سورۂ اعراف (7) کی آیت 171 میں اِس واقعے کے لیے 'وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ' (جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر اُن کے اوپر معلق کر دیا تھا، گویا وہ سائبان ہے اور وہ گمان کر رہے تھے کہ وہ اُن پر گرا ہی چاہتا ہے) کے الفاظ آئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے حکم سے ایک عظیم پہاڑ اُن کے سروں پر لٹکنا شروع ہو گیا اور وہ خیال کرنے لگے کہ یہ اب گرا کہ اب گرا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اُن پر اللہ کی قدرت کی ہیبت طاری ہو گئی۔

استاذِ گرامی کے نزدیک یہ واقعہ اللہ کی قدرت اور جلالت کا مظاہرہ تھا۔ اِس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ جو ہستی اُن سے میثاق کر رہی ہے، وہ قادرِ مطلق ہے۔ کوئی چیز اُس کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔ اگر اُنھوں نے اِس معاہدے کی خلاف ورزی کی تو وہ اِس واقعے کی بہ دولت اپنے انجام کا بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”قرآن اور بائیبل، دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سے یہ عہد پہاڑ کے دامن میں اِس طرح لیا گیا کہ طور اپنی جگہ سے اکھڑ کر سائبان کی طرح اُن کے سروں پر لٹک رہا تھا اور اُنھیں لگتا تھا کہ وہ اُن پر گر کر رہے گا۔ قرآن نے یہاں اِس حالت کو پہاڑ کے اُن پر اٹھا لینے سے تعبیر کیا ہے۔ یہ خدا کی قدرت اور اُس کے جلال کا ایک مظاہرہ تھا،

جو اِس لیے کیا گیا کہ بنی اسرائیل ہمیشہ اِس بات کو یاد رکھیں کہ جس خدا کے ساتھ وہ یہ عہد باندھ رہے ہیں، اُس کی قدرت کتنی بے پناہ ہے اور اُنھوں نے اگر اِس کی خلاف ورزی کی تو وہ اُن کے ساتھ کیا معاملہ کر سکتا ہے۔" (البیان 1 / 78)

4۔ اصحابِ کہف کا قریباً دو سو سال تک سوئے رہنا

اصحاب کہف کو قرآنِ مجید نے 'كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ لوگ اللہ کی نشانیوں میں سے بہت عجیب نشانی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن پر کم و بیش دو سو سال تک نیند کی حالت طاری رکھی اور پھر اُنھیں بیدار کر کے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ واقعہ سورۂ کہف (18) کی آیات 9 تا 25 میں بیان ہوا۔ تمہیداً واقعے کا خلاصہ بیان فرمایا ہے اور اُس کے بعد تفصیلات ذکر کی ہیں۔ تمہیدی آیات یہ ہیں:

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا. اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا. فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا. ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا.(18:9-12)

"کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں سے بہت عجیب نشانی تھے؟ اُس وقت، جب اُن نوجوانوں نے غار میں پناہ لی، پھر (اپنے پروردگار سے) دعا کی کہ اے ہمارے رب، ہم کو تو خاص اپنے پاس سے رحمت عطا فرما اور ہمارے اِس معاملے میں تو ہمارے لیے رہنمائی کا سامان کر دے۔ اِس پر کئی برس کے لیے ہم نے اُس غار میں اُن کے کانوں پر تھپک دیا۔ پھر ہم نے اُن کو اٹھایا تا کہ دیکھیں کہ دونوں گروہوں میں سے کس نے اُن

کے قیام کی مدت ٹھیک شمار کی ہے؟"

اصحاب کہف کے بارے میں غالب گمان یہ ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں، جو مسیحی تاریخ میں سات سونے والے(The Seven Sleepers)کہے جاتے ہیں۔ اِن کا تعلق افیسس(Ephesus) شہر سے ہے۔ یہ موجودہ ترکیہ (Turkiye)کے مغربی ساحل پر واقع ایک مشہور شہر تھا۔ یہ بت پرستی کا ایک بڑا مرکز تھا۔ 249ء سے 251ء تک یہاں قیصر ڈیسیس (Decius) کی حکومت قائم تھی۔ اِس عرصے کے دوران میں مسیح علیہ السلام کے پیرو اپنی دعوت لے کر یہاں پہنچے۔ اصحاب کہف اِسی شہر کے اعلیٰ گھرانوں سے تعلق رکھنے والے چند نوجوان تھے۔ اُنھوں نے پیروانِ مسیح کی دعوت کو صدقِ دل سے قبول کیا اور جوش و جذبے کے ساتھ اُس کی تبلیغ شروع کر دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پورا معاشرہ اُن کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہ اُنھیں سنگ سار کر دیا جائے گا۔ اِس سے بچنے کے لیے وہ شہر سے باہر ایک بڑے غار میں پناہ گزین ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی حفاظت فرمائی اور طویل مدت کے لیے اُن پر نیند طاری کر دی۔ فرشتے اُن کے پہلو بدلتے رہے۔ اُن کے کتے کو غار کے دہانے پر ایسے بٹھا دیا گیا کہ جیسے وہ پہرا دے رہا ہو۔ اللہ کے حکم سے اور اُس کے فرشتوں کی نگرانی میں یہ لوگ کم و بیش 196 سال سوتے رہے۔ پھر بالآخر قیصر تھیوڈوسیس ثانی (Theodosius II)کی سلطنت کے اڑتیسویں سال 444ء یا 447ء میں یہ لوگ بیدار ہوئے۔ اِس دوران میں مسیحی مبلغین کی تبلیغ سے رومی شہنشاہ قسطنطین (272ء-337ء) عیسائیت قبول کر چکا تھا اور اِس کے نتیجے میں ساری رومی سلطنت میں مسیح علیہ السلام کا مذہب پھیل گیا تھا۔ چنانچہ جب یہ لوگ بیدار ہوئے تو ہر طرف مسیحیت کا غلبہ تھا۔ باہر کے حالات سے بے خبر اِن لوگوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو شہر میں بھیجا تاکہ وہ وہاں سے کھانا لے کر آئے۔ جب کھانا خریدنے کے لیے اُس نے قیصر ڈیسیس کے زمانے کا سکہ پیش کیا تو دکان دار کو شک ہوا کہ شاید اُسے پرانے زمانے کا کوئی دفینہ ملا ہے۔ اِس پر دونوں میں تکرار ہوئی، جس سے لوگ جمع ہو گئے۔ معاملہ بڑھتے بڑھتے حکام تک پہنچ گیا۔ اُس شخص کو اُن کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں سوالات ہوئے تو

اُسے معلوم ہوا کہ قیصر ڈیسیس کو مرے ہوئے تو برس ہا برس بیت چکے ہیں۔ یہ جان کر اُس نے اپنی ساری داستان اُنھیں سنادی۔ اُسے سن کر حکام بہت حیران ہوئے اور تصدیق کے لیے اُس کو لے کر غار کی طرف چل پڑے۔ لوگوں کا ایک ہجوم اُن کے ساتھ تھا۔ وہاں پہنچ کر یہ بات متحقق ہو گئی کہ وہ فی الواقع قیصر ڈیسیس کے زمانے کے لوگ ہیں۔ نئے رومی حکمران قیصر تھیوڈوسیس کو اِس غیر معمولی خبر سے مطلع کیا گیا۔ وہ اُن کی زیارت کے لیے احتراماً پیدل چل کر وہاں آیا اور آکر اُن سے برکت لی۔ اِس کے بعد یہ ساتوں نوجوان غار میں جا کر لیٹ گئے اور اچانک وفات پا گئے۔[3]

قرآنِ مجید نے اِس واقعے کو آیت قرار دیا ہے۔ یہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ایک خارقِ عادت نشانی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ اِس کے ظاہر کرنے کا سبب کیا تھا؟ استاذِ گرامی نے اِس کے بارے میں اپنا رجحان بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ”اِس حسی دلیل کی ضرورت غالباً اِس لیے پیش آئی کہ اُس زمانے میں مسیحی دعوت یونان کے فلسفے اور رومی شرک و بت پرستی کی روایت سے نبرد آزما تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ نشانی دکھائی تاکہ زندگی بعد موت کے معاملے میں عقلی دلائل کے ساتھ یہ حسی دلیل بھی پیش کر دی جائے۔ اِس سے مقصود یہ تھا کہ نئے نئے جو لوگ ہزاروں کی تعداد میں مسیحی ہوئے ہیں، اُن کے لیے دین کا یہ بنیادی عقیدہ فلسفیانہ موشگافیوں کا موضوع بن کر نہ رہ جائے۔ بائیبل اور قرآن، دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ رسالت میں اِس طرح کے حسی دلائل اِس سے پہلے بھی وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے ہیں۔“
>
> (البیان 3/131)

---

[3] یہ تفصیلات ”البیان“ میں سورۂ کہف کے حواشی 8 تا 36 سے ماخوذ ہیں۔

—3—

انفس و آفاق میں
نبیوں کے ہاتھوں پر ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی

اللہ کی آیات کی تیسری صورت وہ خارقِ عادت اور خلافِ معمول نشانیاں ہیں، جنھیں اللہ اپنے نبیوں کو عطا فرماتا ہے۔ حقیقت میں یہ اُسی طرح کے حیرت انگیز اور عقل کو عاجز کر دینے والے احوال ہیں، جو دستِ قدرت سے براہِ راست ظاہر ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اِن کے ظہور میں انبیا کا توسط اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ معاملات کی باگ گویا پیغمبر کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ چنانچہ عالم شہود میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے، اُسی کی وساطت اور اُسی کے توسل سے ہوتا ہے۔ اِس کی ایک دل نواز مثال اللہ تعالیٰ کا موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا درجِ ذیل حکم ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ. وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ. (الدخان 44:23-24)

”اچھا تو میرے بندوں کو رات ہی رات میں لے کر نکل جاؤ اور آگاہ رہو کہ تمھارا پیچھا کیا جائے گا۔ اور ہاں، دریا (سے گزرنے کے بعد اُس) کو پر

سکون چھوڑ دینا۔ اِس میں کچھ شک
نہیں کہ یہ لوگ اب غرق ہونے والا
لشکر ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو لے کر نکل جانے کے بعد اپنے عصا کے ذریعے سے دریا کو برابر پر سکون کرتے جانا۔ استاذِ گرامی اِس حکم کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"قرآن اور بائیبل، دونوں میں تصریح ہے کہ دریا کا پانی موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کے گزرنے کے لیے تند ہواؤں کے ذریعے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ یہ حکم اِسی بنا پر دیا گیا اور اِس کے نتیجے میں بنی اسرائیل کے گزرتے ہی وہ ہٹا ہوا پانی واپس آ کر فرعون اور اُس کی فوجوں پر چھا گیا، جو اُس وقت بنی اسرائیل کا تعاقب کرتے ہوئے دریا کے بیچ میں پہنچ چکی تھیں۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو حکم کا اسلوب ایسا ہے کہ گویا دریا اُس وقت پیغمبر کے اختیار میں دے دیا گیا تھا، جسے اگر پر سکون ہونا تھا تو اُسی کی اجازت سے ہونا تھا۔"

(البیان 4/ 483-484)

انبیا کے ذریعے سے ظاہر ہونے والی یہی آیات ہیں، جنھیں اصطلاح میں معجزات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[4] اِن کی حیثیت بینات، یعنی روشن و رخشاں دلائل کی ہوتی ہے، جو عارف و عامی اور حامی و مخالف، سب کے لیے یکساں معتبر ہوتے ہیں۔ ایمان کی نعمت سے فیض یاب عاقل اور سلیم الطبع لوگ اِن کا تقاضا نہیں کرتے، تاہم یہ اُن کے لیے انعام و اکرام یا ازدیادِ ایمان کا باعث بنتے ہیں۔ منکرین اور معاندین اِن کے طلب گار ہوتے ہیں۔ لٰہذا اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور مشیت کے مطابق اُن کی تذکیر و تنبیہ یا تادیب و تعذیب کے لیے اِنھیں نازل

---

[4] واضح رہے کہ قرآنِ مجید میں معجزے کی اصطلاح اختیار نہیں کی گئی۔ وہاں اِس مفہوم کے لیے آیت ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ معجزے کے مفہوم پر مفصل معلومات کے لیے اِسی تصنیف میں ضمیمہ 1 ملاحظہ کیجیے۔

فرماتے ہیں۔

استاذِ گرامی نے اِس امر کی وضاحت میں لکھا ہے:

”نبی کی شخصیت انسانیت کا مظہرِ اتم اور اُس کی دعوت انسان کی فطرت پر مبنی ہوتی ہے ... وہ لوگوں سے جو کچھ کہتا ہے، عقل و بصیرت کے آخری معیار پر کہتا ہے اور اُنھی چیزوں کے بارے میں کہتا ہے، جن سے انسان غافل ہوتا یا اُنھیں بھلا بیٹھتا ہے۔ پھر اُس کی نبوت کے پیچھے اخذ و اکتساب کا کوئی پس منظر بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اُس کو پہچاننے میں کسی سلیم الفطرت شخص کو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ انسان کے دل و دماغ بیدار ہوں تو روے و آواز پیمبر معجزہ ست۔

تاہم اِس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اُس کو ایسی بینات بھی عطا فرماتے ہیں کہ معاندین اگرچہ زبان سے اقرار نہ کریں، لیکن اُس کی صداقت پر یقین کے سوا اُن کے لیے بھی کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔“(میزان 133-134)

اِن آیات یا معجزات کی نوعیت اور حقیقت کے بارے میں قرآنِ مجید سے جو رہنمائی ملتی ہے، وہ چند نکات میں درجِ ذیل ہے۔

اولاً، اِن معجزات کا ظہور اگرچہ انبیا کے ذریعے سے ہوتا ہے، مگر یہ سرتاسر من جانبِ اللہ ہوتے ہیں۔ اِن کی نوعیت، اِن کے اثر اور موقع و مقام کا فیصلہ اللہ کے اذن پر منحصر ہوتا ہے۔ انبیاورسل اِنھیں اُسی وقت ظاہر کرتے ہیں، جب اُنھیں اللہ کا حکم ہو۔ اِن کے ظہور اور وقوع میں نبی کا کام فقط یہ ہوتا ہے کہ وہ مثال کے طور پر اپنا عصا پتھر پر مارے یا اُسے زمین پر ڈال دے یا مٹھی بھر ریت کو کفار کے لشکر کی طرف پھینکے یا منزل من اللہ کلام کی تلاوت کا فریضہ انجام دے۔ سورۂ مائدہ (5) میں اللہ تعالیٰ نے قیامت میں پیش آنے والے اُس واقعے کو بیان فرمایا ہے کہ جب نصاریٰ پر اتمام حجت کے لیے سیدنا مسیح علیہ السلام کو عطا کیے گئے معجزات کا ذکر کیا جائے گا۔ اُس موقع پر 'بِاِذْنِیْ' (میرے حکم سے) کے الفاظ کو بار بار دہرایا جائے گا۔ اِس سے مقصود یہ باور کرانا ہو گا کہ جن معجزات کو بنیاد بنا کر اُنھوں نے مسیح کو اللہ کی الوہیت

میں شریک کیا، وہ اللہ ہی کی جانب سے تھے اور اُسی کے حکم پر مبنی تھے۔ نصاریٰ نے اُنھیں حضرت مسیح سے منسوب کرکے ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ ارشاد فرمایا ہے:

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَ عَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۫ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ .

”جب اللہ کہے گا: اے مریم کے بیٹے عیسیٰ، میری اُس عنایت کو یاد کرو، جو میں نے تم پر اور تمھاری ماں پر کی تھی، اُس وقت، جب میں نے روح القدس سے تمھاری مدد کی، تم گہوارے میں بھی (اپنی نبوت کا) کلام کرتے تھے اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی۔

وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ .

اور اُس وقت، جب میں نے تمھیں قانون اور حکمت سکھائی، یعنی تورات و انجیل کی تعلیم دی۔ اور اُس وقت، جب تم میرے حکم سے پرندے کی ایک صورت مٹی سے بناتے تھے، پھر اُس میں پھونکتے تھے اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کردیتے تھے۔

وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ.(110:5)

اور اُس وقت، جب تم مردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتے تھے۔ اور اُس وقت، جب میں نے بنی اسرائیل کے ہاتھ تم سے روک دیے،

جب تم کھلی ہوئی نشانیاں لے کر اُن
کے پاس آئے اور اُن کے منکروں نے
کہا کہ کچھ نہیں، یہ تو کھلا ہوا جادو
ہے۔"

امام امین احسن اصلاحی اِس مقام کی تفسیر میں اللہ کے اذن کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ تمام باتیں قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نصاریٰ پر حجت تمام کرنے کے لیے فرمائے گا۔ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں نصاریٰ پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے گی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ پر جو انعام بھی ہوا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا، اُنھوں نے جو معجزے بھی دکھائے، سب اللہ کے اذن و حکم سے دکھائے اور یہودیوں نے اُن کو جن خطرات میں ڈالا، اُن سے اُن کو اللہ تعالیٰ ہی نے نکالا۔ پھر جب یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے کیا اور اِس کے سب سے بڑے گواہ خود عیسیٰ ہیں تو نصاریٰ بتائیں کہ اُنھوں نے کس کے کہنے سے اُن کو خدا بنا ڈالا؟ یہاں 'بِاِذْنِیْ' (میرے حکم سے) کی تکرار نہایت بلیغ ہے۔ ایک ایک بات پر اللہ تعالیٰ اِس کو دہرائے گا اور اِن میں سے ہر بات پر سیدنا مسیح علیہ السلام 'اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا' ہی کہیں گے تو ظاہر ہے کہ جن معجزات کے بل پر نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بنایا، جب وہ سب خدا کے 'اذن' سے ہوئے اور اُس کا اعتراف خود معجزات کا دکھانے والا ہی کرے گا تو نصاریٰ کے حصے میں فضیحت اور رسوائی کے سوا اور کیا باقی رہ جائے گا؟" (تدبر قرآن 2/607)

ثانیاً، اِنھیں علم و ہنر کا کمال نہیں سمجھا جا سکتا۔ نہ اِنھیں شعبدہ اور فریبِ نظر قرار دے کر رد کرنا ممکن ہوتا ہے اور نہ سحر و ساحری کہہ کر قبول کرنے سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ اِن چیزوں کے ماہرین بھی اِن کی صحت اور قطعیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ اخذ و اکتساب کی سطح سے بلند اور سحر و ساحری سے ماورا کوئی منفرد معاملات

ہیں۔ استاذِ گرامی لکھتے ہیں:

”اِن معجزات کو کوئی شخص سحر و ساحری یا علم و فن کا کمال کہہ کر رد نہیں کر سکتا، اِس لیے کہ اِس طرح کے علوم و فنون کی حقیقت اُس کے ماہرین سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا اور وہ بھی اُن کے سامنے اعترافِ عجز پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے جن دو معجزات کا ذکر اوپر ہوا ہے، اُن کا اثر مٹانے کے لیے فرعون نے یہی امتحان کیا تھا۔ قرآن کا بیان ہے کہ اُس نے تمام مملکت میں ہرکارے بھیج کر ماہر جادوگر بلائے اور میلے کے دن اُنھیں مقابلے کے لیے پیش کر دیا۔ اُس نے یہ اہتمام فتح کی توقع میں کیا تھا، لیکن ہوا یہ کہ جادوگروں نے عصاے موسوی کو اپنا طلسم نگلتے دیکھا تو بے اختیار سجدہ ریز ہو گئے اور اعلان کر دیا کہ وہ موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لے آئے ہیں۔ یہ ایمان چونکہ حقیقت کو بہ چشم سر دیکھ لینے سے پیدا ہوا تھا، اِس لیے ایسا راسخ تھا کہ فرعون نے جب اُنھیں دھمکی دی کہ میں تمھارے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ دوں گا اور تمھیں کھجور کے تنوں پر سر عام سولی کے لیے لٹکا دوں گا تو وہی جادوگر جو چند لمحے پہلے بڑی لجاجت کے ساتھ اُس سے انعام کی درخواست کر رہے تھے، پکار اٹھے کہ ماہِ نخشب اور خورشیدِ جہاں تاب کا یہ فرق دیکھ لینے کے بعد اب ہمیں کسی چیز کی کوئی پروا نہیں ہے:

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا. اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى. (طٰہٰ20: 72-73)	”جادوگروں نے جواب دیا: ہم اُن روشن نشانیوں پر ہرگز تم کو ترجیح نہ دیں گے، جو ہمارے سامنے آچکی ہیں اور نہ اُس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ اِس لیے تمھیں جو کرنا ہے، کر گزرو۔ تم جو کچھ کر سکتے ہو، اِسی دنیا کی زندگی کا کر سکتے ہو۔ ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں، اِس لیے کہ وہ ہماری خطائیں

معاف کر دے اور اُس جادو کو بھی
معاف فرمائے، جس پر تونے ہمیں
مجبور کیا ہے۔ اللہ ہی بہتر ہے اور وہی
باقی رہنے والا ہے۔‘‘

(میزان 136)

ثالثاً، اِن معجزات کا ایک بڑا مقصد منکرین اور معاندین پر اتمام حجت ہوتا ہے۔ یعنی جو لوگ عقل و فطرت کے دلائل پر دھیان نہیں دے رہے اور بلا جواز نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں، اُن کے پاس حق سے انحراف کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ چنانچہ اِن کے ظہور کے بعد منکرین کے لیے انکار کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ وہ اگر زبان سے اِنھیں جھٹلا بھی رہے ہوں، مگر اُن کے دل و دماغ اِن کے اقرار پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ اظہر من الشمس ہوتے اور ہر عام و خاص کے لیے یکساں لائق حجت ٹھہرتے ہیں۔ اتمام حجت کا ایک پہلو منکرین کو ایمان لانے کا مزید موقع دینا بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ جب منکرین پیغمبر سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور اُس کے روبرو اِس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو، وہ اگر درست ہے تو پھر اُس عذاب کو لے آؤ تو اِس کے جواب میں عذاب کے بجاے حسی معجزات دکھا کر اُنھیں عذاب کے یقینی ہونے کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے رحمت کا ظہور ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی آنکھیں عقل و فطرت کے بین دلائل سے نہیں کھلیں، ممکن ہے کہ اِن غیر معمولی واقعات کو دیکھ کر کھل جائیں اور وہ ایمان لانے پر آمادہ ہو جائیں۔ اِس کی مثال قوم ثمود میں اونٹنی کا ظاہر ہونا ہے۔ امام امین احسن اصلاحی اِس کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’یہ اونٹنی قوم کے مطالبۂ عذاب کے جواب میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ایک نشانی عذاب کی حیثیت سے نام زد کی گئی تھی۔ چنانچہ قرآن میں تصریح ہے کہ جب ثمود کے لیڈر نے اِس کی کونچیں کاٹ دیں تو اِس کے تیسرے دن عذاب الٰہی آدھمکا۔...

مطالبۂ عذاب کے جواب میں عذاب کے بجاے ایک نشانی عذاب کی نام زدگی اللہ تعالیٰ کی رحمت و رافت کی دلیل تھی۔ وہ قہر میں دھیما اور رحمت میں جلدی کرنے والا ہے۔ اِس وجہ سے اُس نے یہ پسند فرمایا کہ لوگوں کو مزید مہلت دے کہ اب بھی وہ متنبہ ہونا چاہیں تو متنبہ ہو جائیں، لیکن اُنھوں نے متنبہ ہونے کے بجاے جسارت کا آخری قدم اٹھا دیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔"(تدبر قرآن 3/ 301-302)

رابعاً، انبیا علیہم السلام کو معجزات عطا کرنے کے اصل اسباب تو اتمام حجت اور اُن کے مطالبۂ عذاب کے جواب میں عذاب سے قبل آخری تنبیہات ہی ہوتی ہیں، لہٰذا بالعموم یہ اُن کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں دیے جاتے ہیں، مگر بعض صورتوں میں دعوت کی ابتدا ہی میں اُنھیں اِن سے لیس کر دیا جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر مقصد مخاطبین کو مرعوب کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ کسی جابرانہ اقدام سے باز رہیں اور بات سننے کے لیے آمادہ ہو سکیں۔ اِس کی نمایاں مثالیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیے جانے والے عصا اور یدِ بیضا کے معجزات ہیں۔ رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآنِ مجید کی صورت میں جو عظیم الشان معجزہ عطا کیا گیا، اُس کا ایک پہلو بھی یہی ہے۔ امام امین احسن اصلاحی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے معجزات کے حوالے سے اِسی پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"... معجزات کے باب میں معروف سنتِ الٰہی تو یہ رہی ہے کہ وہ حضرات انبیا کو اُس وقت دیے گئے ہیں، جب اُن کی قوموں نے شدت کے ساتھ اُن کا مطالبہ کیا ہے اور مقصود اِن کے دیے جانے سے صرف اتمام حجت رہا ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لے رہے ہیں، کسی معجزے ہی کے لیے بہ ضد ہیں، اُن کے پاس حق سے انحراف کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ خاص معاملہ کیوں ہوا کہ اُن کو منصبِ نبوت پر مامور کرتے ہی دو معجزے دے دیے گئے؟ ہمارے نزدیک اِس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسے سرکش اور جابر حکمران کی طرف رسول بنا کر بھیجے جا رہے تھے، جو شخصی اور قومی، دونوں اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام

کا جانی دشمن تھا۔ اُن کی بات سننا اور سمجھنا تو درکنار اندیشہ اِس بات کا تھا کہ یہ علم ہوتے ہی کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، فوراً اُن کے قتل کا حکم دے دیتا۔ بلکہ اُن کے قتل کا حکم تو اُسی وقت وہ دے چکا تھا، جب قبطی کے قتل کا واقعہ پیش آیا تھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام چھپ کر مدین چلے گئے، اِس وجہ سے وہ اپنے ارادے میں ناکام رہا۔ ایک ایسے منتقم و جبار کے سامنے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک رسول کی حیثیت سے انذار کے لیے جاتے تو بھلا وہ اُن کی بات سننے کا کب روادار ہوتا! وہ تو صرف اُسی شکل میں کوئی بات سننے کے لیے تیار ہو سکتا تھا، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں کوئی ایسی بات ظاہر ہوتی، جو اُس کو مرعوب کر دیتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شروع ہی میں اُن کو دو ایسے معجزوں سے مسلح کر دیا، جن کی مدد سے وہ اپنے دشمن کی ہر تعدی سے محفوظ رہے اور اُنھوں نے فرعون کے سامنے جاتے ہی، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہو گا، اپنے اِن معجزات کا اظہار بھی کر دیا تاکہ وہ خبردار رہے کہ اگر اُس نے کوئی غلط اقدام کیا تو وہ بھی خالی ہاتھ نہیں آئے ہیں، بلکہ اُن کے ہاتھ میں بھی وہ عصا ہے، جو ہر کبر و غرور کا سر پاش پاش کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔“(تدبر قرآن 5/ 36)

خامساً، آیاتِ بینات یا انبیا کے معجزات کی نوعیت کے تعین میں مخاطبین کے حالات اور رجحانات کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیا کے ہاتھوں ایسے خارقِ عادت معاملات کا صدور ہوتا ہے، جو اُن کے فہم و استدلال، بود و باش اور تہذیب و تمدن سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اِسی بنا پر یہ اُن کے لیے توجہ اور حیرت و استعجاب کا باعث ہوتے اور نتیجتاً اتمامِ حجت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ امام امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

”معجزات کے باب میں سنتِ الٰہی یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ قوموں کے مذاق اور رجحانات کی رعایت سے دیے جاتے ہیں تاکہ اُن پر حجت ہو سکیں۔ مصر میں، تاریخوں سے پتا چلتا ہے کہ اِس دور میں سحر و شعبدہ کا بڑا زور اور سوسائٹی میں ساحروں کو بڑا مقام حاصل تھا، اِس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسے معجزے دیے، جن سے

ساحروں کے طلسم کو باطل کیا جا سکے۔ عربوں میں اِس کے برعکس، سب سے زیادہ قدر و عظمت فصاحت و بلاغت کو حاصل تھی اور سوسائٹی پر دھاک خطیبوں اور شاعروں کی بیٹھی ہوئی تھی۔ اِس وجہ سے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا معجزہ عطا ہوا، جس کی فصاحت و بلاغت نے سارے فصیحوں بلیغوں کو عاجز و درماندہ کر دیا۔"

(تدبر قرآن 3/ 343)

سادساً، اِن نشانیوں کے حوالے سے یہ بات بھی متحقق ہے کہ یہ اگرچہ پیغمبر کے ہاتھ سے صادر ہوتی ہیں، مگر اِن کا تعلق اصلاً پیغمبر کی منصبی ذمہ داریوں سے نہیں ہوتا۔ یہ خالصتاً من جانبِ اللہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ اِن کی نوعیت، اِن کے ظہور یا عدم ظہور اور موقع ظہور کا فیصلہ نہ پیغمبر کرتا ہے اور نہ یہ مخاطبین کے مطالبے کے جواب میں ظاہر کی جاتی ہیں۔ قرآنِ مجید نے اِس بات کو سورۂ رعد میں نہایت صراحت سے واضح کیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ.	"یہ منکرین کہتے ہیں کہ اِس شخص پر اِس کے پروردگار کی طرف سے (عذاب کی) کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ (اِنھیں بتاؤ کہ یہ تمھارا کام نہیں ہے، اِس لیے کہ) تم تو صرف خبر دار کرنے والے ہو اور ہر قوم کے لیے اِسی طرح ایک راہ بتانے والا آتا رہا ہے۔
اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ ۭ وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ. (13: 7-8)	(اِن پر عذاب کے لیے کوئی نشانی کب ظاہر ہو گی؟ اِسے اللہ جانتا ہے، جس طرح) ہر مادہ کے حمل کو اللہ جانتا ہے اور جو کچھ رحموں میں گھٹتا اور بڑھتا

ہے، اُس کو بھی جانتا ہے۔ ہر چیز اُس
کے ہاں ایک اندازے کے مطابق
ہے۔"

امام امین احسن اصلاحی اِن آیات کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"'ایت' سے مراد یہاں کوئی نشانی عذاب ہے۔ اوپر والی آیت میں جس عذاب کے لیے عجلت کا ذکر ہے، یہ اُسی کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر ہمیں جس عذاب کے ڈراوے ہر وقت سنا رہے ہیں، آخر اُس کی کوئی نشانی یہ کیوں نہیں دکھاتے؟ فرمایا کہ تمھارا کام صرف لوگوں کو اِس عذاب سے خبردار کر دینا ہے، اُس کی کوئی نشانی دکھانا یا اُس عذاب کو لا دینا تمھارا کام نہیں ہے۔ یہ ہمارا کام ہے۔ تم اپنا کام کرو اور ہمارا کام ہم پر چھوڑو۔ اُن کی بکواسوں کی پروا مت کرو۔ ... ایک بات جو ایک امر واقعی اور شدنی ہے، اُس میں اِس بنیاد پر کوئی شبہ قائم کرنا کہ تم اُس کا وقت معین طور پر نہیں بتا سکتے یا اُن کے مطالبے پر اُس کو دکھا نہیں سکتے، کوئی معقول بات نہیں ہے۔ ایک عورت حاملہ ہوتی ہے، اُس کے رحم میں لڑکا ہے یا لڑکی، اِس کو صرف اللہ ہی جانتا ہے، اِس میں درپردہ جو کمی بیشی واقع ہوتی ہے، اُس کو بھی اللہ ہی جانتا ہے، اُس کے وضع کا ٹھیک ٹھیک وقت بھی اللہ ہی کے علم میں ہوتا ہے۔ اِن باتوں کے نہ جاننے سے نہ تو نفس حمل کی نفی ہوتی اور نہ کوئی عاقل اِس بنیاد پر ایک حاملہ کے حاملہ ہونے سے انکار کرتا ہے۔ یہی مثال اُن ظالموں کے لیے عذاب الٰہی کی ہے۔ اُنھوں نے اپنے عقائد و اعمال کے فساد کے باعث اِس کا حمل قبول کر لیا ہے اور یہ حمل لازماً اپنی مدت کو پہنچ کر ظہور میں آئے گا، لیکن کب آئے گا اور کس شکل و صورت میں آئے گا، اِس کا ٹھیک ٹھیک پتا صرف اللہ ہی کو ہے، کسی دوسرے کو اِس کا علم نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں ہر چیز کے لگے بندھے ضابطے، معین پیمانے اور مقرر اوقات ہیں۔ لوگوں کی جلد بازی سے وہ سنتِ الٰہی متغیر نہیں ہوتی، جو اُس نے ہر چیز کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔" (تدبر قرآن 4/ 274)

سابعاً، قرآنِ مجید سے واضح ہوتا ہے کہ معجزات اگرچہ معمول سے ہٹ کر ہوتے ہیں اور عام عادات اور قوانین کے بر خلاف ہوتے ہیں، مگر اُن کا ظہور اسباب کے دائرے کے اندر اور اُنھی کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے مطالبات کو رد فرمادیتے ہیں، جو حیطۂ اسباب سے باہر ہوں۔ سورۂ مائدہ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق اپنی نشانیوں کا ذکر کیا ہے، وہاں حواریوں کا یہ سوال بھی مذکور ہے کہ کیا اللہ آسمان سے کھانے کے خوان اتار سکتا ہے؟ اِس بے جا مطالبے پر حضرت مسیح علیہ السلام نے اُنھیں تنبیہ کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی اِسے پسند نہیں فرمایا۔ یہ مقام درجِ ذیل ہے:

اِذۡ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ یٰعِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ هَلۡ یَسۡتَطِیۡعُ رَبُّكَ اَنۡ یُّنَزِّلَ عَلَیۡنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ.

”اُس وقت، جب حواریوں نے کہا: اے عیسیٰ ابنِ مریم، کیا تمھارا پرور دگار یہ کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے (کھانے کا) ایک خوان اتارے؟ عیسیٰ نے کہا: خدا سے ڈرو، اگر تم سچے مومن ہو۔

قَالُوۡا نُرِیۡدُ اَنۡ نَّاۡكُلَ مِنۡهَا وَ تَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُنَا وَ نَعۡلَمَ اَنۡ قَدۡ صَدَقۡتَنَا وَ نَكُوۡنَ عَلَیۡهَا مِنَ الشّٰهِدِیۡنَ. قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ اَنۡزِلۡ عَلَیۡنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوۡنُ لَنَا عِیۡدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰیَةً مِّنۡكَ ۚ وَ ارۡزُقۡنَا وَ اَنۡتَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ.

اُنھوں نے جواب دیا: ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ اِس خوان سے کھائیں اور اِس کے نتیجے میں ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہم یہ جان لیں کہ تونے ہم سے سچی بات کہی تھی اور ہم اِس پر گواہی دینے والے بن جائیں۔ اِس پر عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی: اے اللہ، اے ہمارے پروردگار، تو ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر دے، جو

ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے ایک یادگار بن جائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو۔ (پروردگار)، ہم کو عطا فرما اور تو بہترین عطا فرمانے والا ہے۔

قَالَ اللّٰهُ اِنِّیۡ مُنَزِّلُهَا عَلَيۡكُمۡ‌ۚ فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بَعۡدُ مِنۡكُمۡ فَاِنِّىۡۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ.

(115-112:5)

اللہ نے فرمایا: میں اِس کو تم پر ضرور نازل کر دوں گا، مگر اِس کے بعد جو تم میں سے منکر ہوں گے، اُنھیں ایسی سخت سزا دوں گا، جو دنیا میں کسی کو نہ دی ہو گی۔“

امام امین احسن اصلاحی ’هَلۡ يَسۡتَطِيۡعُ رَبُّكَ‘ کے الفاظ کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”’هَلۡ يَسۡتَطِيۡعُ رَبُّكَ‘ کے سوال کے باب میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حوارین کا سوال خدا کی قدرت سے متعلق نہیں، بلکہ اُس کی حکمت سے متعلق تھا کہ اِس قسم کی کھلی ہوئی نشانی دکھانا اُس کی حکمت کے مطابق بھی ہو گا یا نہیں؟ حوارین باایمان لوگ تھے، وہ اِس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ اُن کی یہ درخواست مشابہ ہے اُس مطالبہ سے جو بنی اسرائیل نے خدا کو دیکھنے کے لیے کیا تھا، جس کے نتیجہ میں اُن کو کڑک نے آدبوچا تھا۔ معجزات ہر چند خارقِ عادت ہوتے ہیں، تاہم وہ اسباب کے پردے ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ تمام پردے اٹھا دیے جائیں۔ اِسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اِس طرح کے مطالبات کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی، جن میں خواہش اُن حدود سے متجاوز ہو جائے، جو معجزات کے ظہور کے لیے سنت اللہ میں مقرر ہیں۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اِس سے روکا اور جب حوارین کی دوبارہ درخواست پر اِس کے لیے درخواست فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے اِس درخواست کو پسند نہیں فرمایا، بلکہ ارشاد ہوا کہ اتارنے کو تو میں مائدہ اتار دوں گا، لیکن یاد رکھو کہ جو لوگ اتنی کھلی نشانیاں دیکھنے کے بعد

کفر میں مبتلا ہوں گے، اُن کو سزا بھی وہ دوں گا، جو کسی اور کو نہ دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے اِس کے بعد حواریین اپنی اِس درخواست سے باز آ گئے۔ اہل تاویل میں سے بھی ایک گروہ کا یہی خیال ہے کہ اِس کا نزول نہیں ہوا۔ انجیلوں میں بھی اِس کا ذکر نہیں ہے۔‘‘

(تدبر قرآن 2/608)

اِن ضروری توضیحات کے بعد اِس نوعیت کی آیات اور نشانیوں کی چند نمایاں مثالیں درجِ ذیل ہیں۔

1۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو دو بڑی آیات دی گئیں، اُن میں سے ایک عصا اور دوسری یدِ بیضا ہے۔ یہ نہایت غیر معمولی آیات تھیں، جو اُنھیں بعثت کے ساتھ ہی عطا کر دی گئیں۔ اُن کے اکثر معجزات اِنھی کے ذریعے سے ظہور پذیر ہوئے۔ یہ دونوں آیات اُنھیں طویٰ کی مقدس وادی میں عطا کی گئیں۔ قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے واپسی پر طویٰ کی وادی میں پہنچے تو اُنھیں ایک شعلہ سا دکھائی دیا۔ وہ اُسے آگ سمجھ کر اُس کی سمت میں آگے بڑھے۔ وہاں پہنچے تو غیب سے ندا آئی کہ ”یہ تو میں تمھارا پروردگار ہوں، سو اپنے جوتے اتار دو، اِس لیے کہ تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ اور میں نے تمھیں منتخب کر لیا ہے، لہٰذا جو وحی کی جا رہی ہے، اُس کو توجہ سے سنو۔“ اِسی موقع پر اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اپنا عصا زمین پر ڈال دیں، اُنھوں نے ایسا کیا تو وہ رینگتا ہوا سانپ بن گیا۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ اپنا ہاتھ بغل میں ڈال کر واپس نکالو، جب اُنھوں نے اِس حکم کی تعمیل کی تو اُن کا ہاتھ بالکل سفید اور چمک دار ہو گیا۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہے:

وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى. قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ اَهُشُّ بِهَا	”اور یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے، اے موسیٰ؟ اُس نے کہا: یہ میری لاٹھی

عَلٰى غَنَمِىْ وَ لِىَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى. قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى. فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِىَ حَيَّةٌ تَسْعٰى.

ہے، میں اِس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اِس سے اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں اور اِس میں میرے کچھ دوسرے کام بھی ہیں۔ فرمایا: اِس کو (زمین پر) ڈال دو، اے موسیٰ! اِس پر موسیٰ نے لاٹھی کو (زمین پر) ڈال دیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ ایک سانپ ہے، جو دوڑ رہا ہے۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى. وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى. لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى.(20:17-23)

فرمایا: اِس کو اٹھالو اور ڈرو نہیں، ابھی ہم اِس کو ویسا ہی کر دیں گے، جیسی یہ پہلے تھی۔ اور اپنے ہاتھ کو (ذرا) تم اپنے بازو کی طرف سکیڑو، وہ بغیر کسی بیماری کے سفید ہو کر نکلے گا، ایک دوسری نشانی کے طور پر۔ یہ اِس لیے کہ (اِن کے ذریعے سے) ہم اپنی کچھ بڑی بڑی نشانیاں تمھیں دکھائیں۔"

امام امین احسن اصلاحی اِن آیات کی تفسیر میں عصا اور یدِ بیضا کے معجزات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"عصا کا معجزہ: ارشاد ہوا کہ اِس لٹھیا کو زمین پر ڈال دو اور پھر قدرتِ خداوندی کا کرشمہ دیکھو! چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لٹھیا زمین پر ڈال دی اور وہ دفعتاً ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گئی۔ سانپ کو دیکھ کر ڈرنا ایک امر طبعی ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اِس منظر کو دیکھ کر ڈرے کہ ہاتھ کی لٹھیا جو سانپ کو مارنے والی بن سکتی تھی، وہ خود سانپ بن گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کو اطمینان دلایا کہ ڈرو نہیں، اِس کو بے جھجک پکڑ لو۔

تمھارے پکڑتے ہی ہم اِس کو اِس کی پہلی حالت پر کر دیں گے۔ یہ جیسی لٹھیا تھی، ویسی ہی لٹھیا بن جائے گی۔

یدِ بیضا کا معجزہ: ساتھ ہی دوسری ہدایت یہ ہوئی کہ اپنے ہاتھ کو اپنی بغل کی طرف سکیڑ لو، پھر جب تم اِس کو بغل سے نکالو گے تو وہ وہاں سے چٹا سفید، بغیر کسی مرض کے، ایک دوسری نشانی بن کر برآمد ہو گا۔

یہ دوسرا معجزہ تھا، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوا۔ یہاں 'بَيْضَآءَ' کے ساتھ 'مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ' کی قید اِس شبہ کے ازالہ کے لیے ہے کہ یہ ہاتھ کی سفیدی کسی مرض کے سبب سے نہیں ہو گی، بلکہ اللہ کی ایک نشانی کے طور پر ہو گی۔ اِس سے تورات کی اِس روایت کی تردید ہو جاتی ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ نکالا تو وہ برص سے سفید نکلا۔ یہ امر بھی یاد رکھیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی یہ سفیدی مستقل نہیں تھی، بلکہ قرآن کے الفاظ شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اِس کے ظہور کو اِس شرط کے ساتھ خاص کیا تھا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک نشانی کے طور پر دکھانے کے لیے اپنا ہاتھ اپنی بغل میں ڈال کر نکالیں گے، تب یہ سفید نکلے گا۔

'لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى' (یہ اِس لیے کہ (اِن کے ذریعے سے) ہم اپنی کچھ بڑی بڑی نشانیاں تمھیں دکھائیں۔) یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے مستقبل کی فتوحات کی بشارت ہے کہ بہ ظاہر تو یہ دو ہی معجزے ہیں، لیکن یہ دو نہیں ہیں، بلکہ اِن کے اندر ہمارے بہت سے دوسرے بڑے بڑے معجزے بند ہیں۔ آگے جب امتحان کے مراحل آئیں گے تو تم دیکھو گے کہ اِن سے ہماری قدرت و قہرمانیت کے کیا کیا کرشمے اور خوارق ظاہر ہوتے ہیں۔" (تدبر قرآن 5/ 35-36)

حضرت موسیٰ علیہ السلام بعثت کے بعد فرعون کے دربار میں پہنچے اور انبیا علیہم السلام کے عام طریقے کے مطابق فرعون اور اُس کے امرا و عمائدین کو توحید اور آخرت کی دعوت پیش کی۔ اِس کے بعد یہ تقاضا کیا کہ وہ بنی اسرائیل کو اُن کے ساتھ بھیج دے۔ جواب میں فرعون نے

اُن سے کوئی نشانی دکھانے کا مطالبہ کیا۔ اِس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر پھینکا تو وہ ایک حقیقی اژدہا بن گیا۔ پھر اُنھوں نے اپنے ہاتھ کو آستین سے نکالا تو دفعتاً وہ چمکنے لگا۔ اہل دربار کو اندازہ ہو گیا کہ یہ عام نوعیت کا سحر نہیں ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے فرعون کو ڈرانے اور برانگیختہ کرنے کے لیے کہا کہ یہ شخص تمھیں اِس ملک سے نکال کر خود قابض ہونا چاہتا ہے۔ اِسے فی الحال ٹال دو اور پھر ملک بھر سے جادوگروں کو جمع کر لو تاکہ وہ اِس کے سحر کا توڑ کر سکیں۔ فرعون نے مشورہ قبول کر لیا اور ہرکارے بھیج کر جادوگروں کو بلا لیا۔ آگے کی تفصیل سورۂ اعراف میں اِن الفاظ میں نقل ہوئی ہے:

وَ جَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ. قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ. قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ. قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ.

”اور جادوگر فرعون کے پاس آ گئے۔ اُنھوں نے کہا: اگر ہم ہی جیت گئے تو بڑا صلہ تو ہمیں یقیناً ملے گا؟ فرعون نے جواب دیا: ہاں، ضرور اور تم ہمارے مقربین میں بھی شامل ہو جاؤ گے۔ اِس پر جادوگروں نے کہا: اے موسیٰ، تم پھینکو گے یا (اگر تم چاہو تو) ہم پھینکتے ہیں؟ اُس نے کہا: تم ہی پھینکو۔ چنانچہ اُنھوں نے جب پھینکا تو لوگوں کی آنکھیں باندھ دیں اور اُن پر دہشت طاری کر دی اور بڑا زبردست جادو بنا لائے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ. فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. فَغُلِبُوْا

ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ اپنا عصا پھینکو۔ پھر اُس کا پھینکنا تھا کہ وہ اُن کے اُس طلسم کو نگلتا چلا گیا، جو وہ بنا

هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ. وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ. قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ.
(122-113:7)

لائے تھے۔ سو حق ظاہر ہوا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے، سب باطل ہو گیا۔ فرعون اور اُس کے ساتھی (اُس روز) وہاں مغلوب ہوئے اور ذلیل ہو کر رہ گئے۔ اور جادوگر (خدا کی اِس نشانی کو دیکھ کر) سجدے میں گر پڑے۔ اُنھوں نے (بے اختیار) کہا: ہم جہانوں کے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں۔ جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے۔‘‘

استاذِ گرامی کے نزدیک اِس مقام پر ’فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ‘ (چنانچہ اُنھوں نے جب پھینکا تو لوگوں کی آنکھیں باندھ دیں) کے الفاظ سے واضح ہے کہ جادو سے کسی چیز کی حقیقت و ماہیت نہیں بدلتی۔ وہ محض نگاہ اور قوتِ متخیلہ کو متاثر کرتا ہے، جس سے انسان وہی کچھ دیکھنے لگتا ہے، جو جادوگر دکھانا چاہتا ہے۔یعنی عصا کا سانپ جدھر جدھر گیا، اُس نے سانپوں کی طرح لہراتی ہوئی ہر رسی اور لاٹھی کو اُسی طرح رسی اور لاٹھی بنا دیا، جس طرح وہ حقیقت میں تھی اور سارا طلسم نابود ہو گیا۔[5]

سورۂ طٰہٰ کے الفاظ ’اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى‘ (جو کچھ اُنھوں نے بنایا ہے، یہ محض جادوگر کا فریب ہے اور جادوگر جہاں سے بھی آئے، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا) سے بھی جادو کے فریب ہونے کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق کے

---

[5] البیان 2/200۔

سامنے آتے ہی ہر شخص پر واضح ہو جاتا ہے کہ جادو کیا ہے اور معجزہ کیا چیز ہوتی ہے۔[6] استاذِ گرامی کے نزدیک: ”یہ بالکل ویسی ہی بات ہے کہ ماہِ نخشب کے مقابلے میں خورشیدِ جہاں تاب نکل آئے۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ منطق و استدلال سے دونوں کا فرق واضح کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ... سحر و ساحری اور اِس طرح کے دوسرے علوم کو اُن کے ماہرین ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اُن میں اور معجزے میں فرق کے لیے یہ نہایت واضح معیار ہے کہ اِن علوم و فنون کے ماہرین بھی اُس کے سامنے اعترافِ عجز پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“[7]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے بنی اسرائیل کے لیے ایک اور عظیم الشان معجزہ یہ صادر ہوا کہ اُنھوں نے عصا کو چٹان پر مارا تو اُس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور اُن کے ہر قبیلے کے لیے الگ الگ پانی کا بندوبست ہو گیا۔ سورۂ بقرہ میں بیان ہوا ہے:

وَ اِذِ اسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ فَقُلۡنَا اضۡرِبۡ بِّعَصَاکَ الۡحَجَرَ ؕ فَانۡفَجَرَتۡ مِنۡہُ اثۡنَتَاعَشۡرَۃَ عَیۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَہُمۡ ....(60:2)	”اور یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا: اپنی لٹھیا اِس پتھر پر مارو۔ (اُس نے ماری) تو اُس سے بارہ چشمے بہ نکلے، اِس طرح کہ ہر گروہ نے اپنے لیے پانی لینے کی جگہ متعین کر لی...۔“

تورات کی کتاب گنتی سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کی چٹان سے پانی بہ نکلنے کا یہ واقعہ دشتِ صین میں پیش آیا ہے۔ اُس میں لکھا ہے:

”اور پہلے مہینے میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت دشتِ صین میں آگئی اور وہ لوگ قادس میں رہنے لگے... اور جماعت کے لوگوں کے لیے وہاں پانی نہ ملا۔ سو وہ موسیٰ اور

[6] جادو اور معجزہ کے فرق پر تفصیلی بحث اِسی تصنیف کے ضمیمہ 3 میں کی گئی ہے۔

[7] البیان 3 / 241۔

ہارون کے بر خلاف اکٹھے ہوئے۔ اور لوگ موسیٰ سے جھگڑنے اور یہ کہنے لگے: ہائے کاش، ہم بھی اُسی وقت مر جاتے، جب ہمارے بھائی خداوند کے حضور مرے۔ تم خداوند کی جماعت کو اِس دشت میں کیوں لے آئے ہو کہ ہم بھی اور ہمارے جانور بھی یہاں مریں؟ اور تم نے کیوں ہم کو مصر سے نکال کر اِس بری جگہ پہنچایا ہے؟ یہ تو بونے کی اور انجیروں اور تاکوں اور اناروں کی جگہ نہیں ہے، بلکہ یہاں تو پینے کے لیے پانی تک میسر نہیں اور موسیٰ اور ہارون جماعت کے پاس سے جا کر خیمۂ اجتماع کے دروازے پر اوندھے منہ گرے۔ تب خداوند کا جلال اُن پر ظاہر ہوا اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اِس لاٹھی کو لے اور تو اور تیرا بھائی ہارون، تم دونوں جماعت کو اکٹھا کرو اور اُن کی آنکھوں کے سامنے اِس چٹان سے کہو کہ وہ اپنا پانی دے اور تو اُن کے لیے چٹان ہی سے پانی نکالنا۔ یوں جماعت کو اور اُن کے چوپایوں کو پلانا۔ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے حضور سے اِسی حکم کے مطابق وہ لاٹھی لی اور موسیٰ اور ہارون نے جماعت کو اُس چٹان کے سامنے اکٹھا کیا اور اُس نے اُن سے کہا: سنو، اے باغیو، کیا ہم تمھارے لیے اِسی چٹان سے پانی نکالیں؟ تب موسیٰ نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اُس چٹان پر دو بار لاٹھی ماری اور کثرت سے پانی بہ نکلا اور جماعت نے اور اُن کے چوپایوں نے پیا۔“(20:1-11)

ایک کے بجاے بارہ چشموں کا پھوٹنا اِس وجہ سے تھا کہ بنی اسرائیل کے خاندان بھی بارہ تھے۔ الگ الگ گھاٹ مقرر ہونے سے اِن کے مابین پانی پر جھگڑنے کی گنجایش ختم ہو گئی۔ اگر پانی وافر مقدار میں میسر نہ ہوتا اور اِس میں تقسیم کا مساوی انتظام نہ ہوتا تو صحرا میں اُن کے درمیان روز پانی پینے پلانے پر تلواریں نکلتی رہتیں۔ لہٰذا یہ غیر معمولی معجزہ ہی نہیں تھا، اِس کے ساتھ اللہ کا بہت بڑا احسان بھی تھا۔ امام امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

”چونکہ پہاڑی سے بارہ چشمے پھوٹے تھے اور بنی اسرائیل کے خاندان بھی بارہ تھے، اِس وجہ سے ہر خاندان نے اپنے اپنے گھاٹ الگ الگ متعین کر لیے اور اِس چیز کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا کہ پانی کے لینے پر کوئی جھگڑا برپا ہو۔ اگر اِس بہتات کے ساتھ پانی کا

انتظام نہ ہوا ہوتا تو اِس صحرا میں اِن لوگوں کے اندر روز پانی پینے پلانے پر ہی تلواریں کھنچی رہتیں۔ اِس وجہ سے یہ واقعہ صرف ایک عظیم معجزہ ہی نہیں، بلکہ ایک عظیم احسان بھی تھا۔“(تدبر قرآن 1 / 223)

2۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر قرآنِ مجید کی سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ میں آیا ہے۔ اِن مقامات پر اُن کے چار نمایاں معجزات بیان ہوئے ہیں۔ آلِ عمران میں بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے سیدہ مریم علیہا السلام کو مسیح علیہ السلام کی پیدایش کی بشارت دی تو اُنھوں نے سوال کیا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے، جب کہ مجھے تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ ایسا ہی ہو گا، کیونکہ اللہ جس معاملے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کے حکم سے وہ ہو جاتا ہے۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی رسالت سے آگاہ فرمایا اور بتایا کہ وہ اُنھیں بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔ اِسی سلسلۂ بیان میں پھر سیدنا مسیح علیہ السلام کے چار معجزات کا ذکر آیا ہے۔ اِن میں سے ایک مٹی سے پرندہ تخلیق کرنا ہے، دوسرا مادر زاد اندھے کو بینا کرنا ہے، تیسرا کوڑھ کے مریض کو اِس لاعلاج مرض سے نجات دلانا ہے اور چوتھا مردوں کو زندہ کرنا ہے۔ اِس ضمن میں یہ بات نہایت صراحت سے بیان ہوئی ہے کہ یہ تمام معجزات اللہ ہی کے حکم سے ظاہر ہوئے تھے۔[8] آیات درجِ ذیل ہیں:

قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ وَلَدٌ وَّ لَمۡ　　　　”وہ بولی: پروردگار، میرے ہاں بچہ

---

[8] اِن میں سے دوسرے اور تیسرے معجزے کا ذکر انجیل میں بھی آیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ قرآن میں اِن میں سے ہر ایک کے ساتھ باذن اللہ کی قید لگی ہوئی ہے، لیکن انجیل میں یہ تصریح نہیں ہے۔ قرین قیاس ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے خدا کا تصور پیدا ہوا ہو گا تو ایسے الفاظ اِس تصور سے بے جوڑ سمجھ کر حذف کر دیے گئے ہوں گے۔

يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ.

کہاں سے ہو گا، مجھے تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں۔ فرمایا: اِسی طرح اللہ جو چاہے، پیدا کرتا ہے۔ وہ جب کسی معاملے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کو اتنا ہی کہتا ہے کہ ہو جا، پھر وہ ہو جاتا ہے۔

وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ. وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۥ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ .

(لہٰذا اِسی طرح ہو گا) اور اللہ اُسے قانون اور حکمت سکھائے گا، یعنی تورات و انجیل کی تعلیم دے گا۔ اور اُس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔ (چنانچہ یہی ہوا اور اُس نے بنی اسرائیل کو دعوت دی کہ) میں تمھارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔

اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْــــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ.

(آل عمران 3:47-49)

میں تمھارے لیے مٹی سے پرندے کی ایک صورت بناتا ہوں، پھر میں اُس میں پھونکتا ہوں تو اللہ کے حکم سے وہ فی الواقع پرندہ بن جاتی ہے؛ اور مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں؛ اور اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں؛ اور میں تمھیں بتا سکتا ہوں، جو کچھ تم کھا کر آتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو۔ اِس میں

تمھارے لیے یقیناً ایک بڑی نشانی
ہے، اگر تم ماننے والے ہو۔''

3۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات

رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بڑا معجزہ دیا گیا، وہ قرآنِ مجید ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے خود اپنا مبارک کلام آپ کی زبانِ فیض ترجمان پر جاری فرما دیا۔ اِس کے الفاظ، اِس کے جملے، اِس کے اسالیب، اِس کے مضامین، اِس کے اخبار، اِس کے احکام، سب اللہ پروردگارِ عالم کے ہیں۔ اِسی بنا پر یہ ایک ایسا معجزہ ہے، جو اپنی ذات میں یکتا، اپنی نوعیت میں بے مثل، اپنے شہود میں کامل اور اپنے ظہور میں لازوال ہے۔

یہ بلاشبہ، خارقِ عادت ہے، کیونکہ انسانی تاریخ میں یہ واحد کتاب ہے، جس کے متن میں نہ کوئی تضاد و تناقض ہے اور نہ تنزل و ارتقا۔ زبان و ادب اِس کی فصاحت و بلاغت اور لطافت و حلاوت کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اِس میں کمال معنویت ہے، بلند خیالی ہے، ژرف نگاہی ہے، وسعتِ نظری ہے۔ یہ عالم الغیب والشہادہ کا قول ہے، لہٰذا کرۂ ارض پر یہ تنہا نوشت ہے، جو مکان و لامکان، دونوں سے باخبر کرتی ہے۔ اِسے پڑھیے تو ماضی کے گم شدہ حقائق واشگاف ہوتے اور مستقبل کے نامعلوم اخبار معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر صاحبِ عقل خواہی ناخواہی یہ ماننے پر مجبور ہے کہ یہ علم و عرفان کا مرقع، دین و اخلاق کا خزانہ اور شریعت و حکمت کا مجموعہ ہے اور انسانوں کی رشد و ہدایت اور فوز و فلاح کے لیے اِس سے بہتر نسخہ زمین پر دستیاب نہیں ہے۔

استاذِ گرامی اِس کے اعجاز کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معجزہ اِس حیثیت سے دیا گیا، وہ قرآن ہے۔ عربی زبان کے اسالیبِ بلاغت اور علم و ادب کی روایت سے واقف ادبی ذوق کے حاملین اِسے پڑھتے

ہیں تو صاف محسوس کرتے ہیں کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک سے زیادہ مقامات پر اِس نے خود اپنے مخاطبین کو چیلنج کیا ہے کہ وہ اگر اپنے اِس گمان میں سچے ہیں کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے، بلکہ محمد اِسے اپنی طرف سے گھڑ کر پیش کر رہے ہیں تو جس شان کا یہ کلام ہے، اُس شان کی کوئی ایک سورت ہی بنا کر پیش کریں۔ اُن کی قوم کا ایک فرد اگر اُن کے بقول بغیر کسی علمی اور ادبی پس منظر کے یہ کام کر سکتا ہے تو اُنھیں بھی اِس میں کوئی دقت نہ ہونی چاہیے۔

قرآن کا یہ دعویٰ ایک حیرت انگیز دعویٰ تھا۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ قرآن ایک ایسا کلام ہے، جس کے مانند کوئی کلام انسانی ذہن کے لیے تخلیق کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ فصاحت و بلاغت اور حسن بیان کے لحاظ سے قرآن کی غیر معمولی انفرادیت کا دعویٰ تھا۔ یہ اِس بات کا دعویٰ تھا کہ وہ کوئی ایسا کلام پیش کریں، جس میں قرآن ہی کی طرح خدا بولتا ہوا نظر آئے، جو اُن حقائق کو واضح کرے، جن کا واضح ہونا انسانیت کی شدید ترین ضرورت ہے اور وہ کسی انسان کے کلام سے کبھی واضح نہیں ہوئے، جو اُن معاملات میں رہنمائی کرے، جن میں رہنمائی کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ ایک ایسا کلام جس کے حق میں وجدان گواہی دے، علم و عقل کے مسلمات جس کی تصدیق کریں، جو ویران دلوں کو اِس طرح سیراب کر دے، جس طرح مردہ زمین کو بارش سیراب کرتی ہے، جس میں وہی شان اور وہی تاثیر ہو، جو قرآن کا پڑھنے والا، اگر اُس کی زبان سے واقف ہو تو اُس کے لفظ لفظ میں محسوس کرتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قرآن کے مخاطبین میں سے کوئی بھی اِس چیلنج کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	”(یہی اِس کتاب کی دعوت ہے، اِسے قبول کرو)، اور جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا

اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ. فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَ لَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَ الۡحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ.
(البقرہ2:23-24)

ہے، اُس کے بارے میں اگر تمھیں شبہ ہے تو (جاؤ اور) اِس کے مانند ایک سورہ ہی بنا لاؤ اور (اِس کے لیے) خدا کے سوا تمھارے جو زعما ہیں، اُنھیں بھی بلا لو، اگر تم (اپنے اِس گمان میں) سچے ہو۔"

خدا کی یہ کتاب اِس وقت بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ اِس پر کم و بیش چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ اِس عرصے میں دنیا کیا سے کیا ہو گئی۔ بنی آدم نے نظریہ و خیال کے کتنے بت تراشے اور پھر خود ہی توڑ دیے۔ انفس و آفاق کے بارے میں انسان کے نظریات میں کتنی تبدیلیاں آئیں اور اُس نے ترک و اختیار کے کتنے مرحلے طے کیے۔ وہ کس کس راہ سے گزرا اور بالآخر کہاں تک پہنچا، لیکن یہ کتاب جس میں بہت سی وہ چیزیں بھی بیان ہوئی ہیں، جو اِن پچھلی دو صدیوں میں علم و تحقیق کا خاص موضوع رہی ہیں، دنیا کے سارے لٹریچر میں بس ایک ہی کتاب ہے، جو اِس وقت بھی اُسی طرح اٹل اور محکم ہے، جس طرح اب سے چودہ سو سال پہلے تھی۔ علم و عقل اِس کے سامنے جس طرح اُس وقت اعترافِ عجز کے لیے مجبور تھے، اُسی طرح آج بھی ہیں۔ اِس کا ہر بیان آج بھی پوری شان کے ساتھ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ دنیا اپنی حیرت انگیز علمی دریافتوں کے باوجود اُس میں کسی ترمیم و تغیر کے لیے کوئی گنجایش پیدا نہیں کر سکی:

وَبِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰهُ وَبِالۡحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا.
(بنی اسرائیل17:105)

"ہم نے اِس قرآن کو حق کے ساتھ اتارا ہے اور یہ حق ہی کے ساتھ اترا ہے اور ہم نے، (اے پیغمبر)، تم کو صرف اِس لیے بھیجا ہے کہ (ماننے والوں کو) خوش

خبری دو اور (نہ ماننے والوں کو)
متنبہ کردو۔‘‘

(میزان 136-138)

قرآنِ مجید کے اِس عظیم الشان معجزے کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حالات کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً مختلف معجزے عطا کیے جاتے رہے ہیں۔ یہاں واضح رہے کہ اللہ کے رسول کی ذات بہ ذاتِ خود ایک عظیم معجزہ ہوتی ہے۔ اللہ اُس سے ہم کلام ہوتا ہے، جبریل امین اُس تک اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں، وہ فرشتوں کی معیت میں ہوتا ہے، اُس کی زبان سے اللہ کا کلام جاری ہوتا ہے۔ وہ آسمان سے خبریں پا کر لوگوں کو غیب سے مطلع کرتا ہے، فیوض و برکات اُس کے وجود سے صادر ہوتے ہیں۔ شاید ہی کوئی دن ہو، جب اللہ کی کوئی آیت، کوئی نشانی اُس کے ماحول میں یا اُس کے وجود سے صادر نہ ہوئی ہو۔ اِس نوعیت کی بعض نشانیاں قرآنِ مجید میں اور بعض حدیث اور سیرت کی کتابوں میں مذکور ہیں۔[9] اِن میں سے بہ طورِ مثال دو معجزات کا تذکرہ درجِ ذیل ہے۔

ایک معجزہ جنگِ بدر کا ہے، جب آپ نے مٹھی بھر خاک کفار کے لشکر کی طرف پھینکی تو وہ ریت کا طوفانی غبار بن کر منکرین کی آنکھوں میں داخل ہو گئی۔ اِس معجزے کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے اور روایتوں میں بھی بعض تفصیلات مذکور ہیں۔ سورۂ انفال میں ارشاد ہے:

فَلَمۡ تَقۡتُلُوۡهُمۡ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمۡ وَمَا رَمَيۡتَ اِذۡ رَمَيۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَ لِيُبۡلِىَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مِنۡهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ.(17:8)

’’(ایمان والو، تم کیوں جان چراؤ، جب کہ تمھاری طرف سے خدا لڑتا ہے)؟ سو حقیقت یہ ہے کہ (اِس جنگ میں) تم نے اِن کو قتل نہیں کیا، بلکہ

9 بعض محققین نے اِن کا استقصا کر کے دلائل النبوہ اور معجزات النبی کے عنوانات کے تحت باقاعدہ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔

اللہ نے اِن کو قتل کیا ہے اور، (اے
پیغمبر)، جب تو نے اِن پر (خاک)
پھینکی تو تو نے نہیں پھینکی، بلکہ اللہ نے
پھینکی ہے، اِس لیے کہ منکروں کو اپنی
شانیں دکھائے اور اِس لیے کہ
مسلمانوں کو اللہ اپنی طرف سے اچھا
انعام عنایت فرمائے۔ بے شک، اللہ
سمیع و علیم ہے۔"

امام امین احسن اصلاحی نے اِس مقام کی وضاحت کے لیے "پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آستین سے دستِ غیب کے کارنامے" کا عنوان قائم کیا ہے اور اُس کے تحت لکھا ہے:

"'فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ' میں خطاب عام مسلمانوں سے ہے اور 'وَمَا رَمَيْتَ' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اِس وجہ سے دونوں میں جمع اور واحد کا فرق ہے۔ 'رمی' تیر مارنے، کنکر پتھر پھینکنے، خاک اور راکھ جھونکنے، سبھی کے لیے آتا ہے۔ روایات میں ہے کہ جب کفار کی فوجیں سامنے ہوئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر خاک زمین سے اٹھائی اور 'شاھت الوجوہ' کہہ کر کفار کی طرف پھینکی۔ 'شاھت الوجوہ' عربی میں لعنت کا فقرہ ہے اور کسی کے اوپر خاک جھونکنا نہایت قدیم زمانہ سے لعنت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ تورات میں بھی اِس کا ذکر آتا ہے اور عرب کی روایات سے بھی اِس کا پتا چلتا ہے۔ سورۂ فیل کی تفسیر میں مولانا فراہی نے اِس کے حوالے دیے ہیں۔ یہاں زبان کا یہ اسلوب بھی نگاہ میں رہے کہ بعض مرتبہ فعل کی نفی سے مقصود نفس فعل کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ اُس فعل کے ساتھ اُن شان دار نتائج کی نسبت کی نفی ہوتی ہے، جو اُس فعل کے پردے میں ظاہر ہوئے۔ مٹھی بھر نہتے مسلمانوں کا قریش کی دل بادل غرقِ آہن فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ڈال دینا یا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے پھینکی

ہوئی چٹکی بھر خاک کا ایک ایسا طوفان بن جانا کہ تمام کفار کو اپنی اپنی آنکھوں کی پڑ جائے، یہ مسلمانوں کی چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تلواروں یا پیغمبر کی 'رمی' کے کارنامے نہیں تھے، بلکہ اُس دستِ غیب کے کارنامے تھے، جو مسلمانوں کی میانوں اور پیغمبر عالم کی آستینوں میں چھپا ہوا تھا۔"(تدبر قرآن 3/451)

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی ایک مثال اللہ کی طرف سے نازل کردہ پیشین گوئیاں ہیں، جن کا اعلان آپ کی زبانِ مبارک سے ہوا۔ اِن میں سے بعض کا ذکر قرآنِ مجید میں ہوا ہے اور بعض روایتوں میں منقول ہیں۔ سرزمین عرب میں آپ کے غلبے، ام القریٰ مکہ کی فتح اور لوگوں کے جوق درجوق دین میں داخل ہونے کے عظیم اور غیر متوقع واقعات کے وقوع سے بہت پہلے آپ نے مطلع فرما دیا تھا۔ ایرانیوں سے مغلوب ہو جانے کے بعد رومیوں کی دوبارہ فتح کی پیشین گوئی بھی ایسی ہی وہم و گمان سے ماورا اور امید و امکان سے بالا تھی۔ قرآنِ مجید میں یہ اِس طرح بیان ہوئی ہے:

غُلِبَتِ الرُّوْمُ. فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ. فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ. بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ. وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ. (الروم 30:2-6)

"رومی مغلوب ہو گئے ہیں۔ قریب کی سرزمین میں، لیکن اپنی اِس مغلوبیت کے بعد وہ جلد ہی غالب ہو جائیں گے۔ اگلے چند برسوں میں۔ اِس سے پہلے جو کچھ ہوا ہے، وہ بھی اللہ کے حکم سے ہوا ہے اور جو کچھ بعد میں ہوگا، وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوگا اور ایمان والے اُس دن اللہ کی مدد سے مسرور ہوں گے۔ اللہ جس کی چاہتا ہے، مدد فرماتا ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور بڑا مہربان بھی۔ اللہ کا حتمی وعدہ ہے

اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں
کرتا، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔‘‘

استاذ گرامی نے اِس واقعے کی تفصیل اِن الفاظ میں کی ہے:

’’اصل میں ’اَدْنَی الْاَرْضِ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے مراد یہاں شام و فلسطین کی سرزمین ہے، جو عرب کی سرزمین کے بالکل متصل تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تو اُس وقت دنیا میں دو بڑی سلطنتیں تھیں: ایک مسیحی رومی سلطنت، دوسرے مجوسی ایرانی سلطنت۔ دونوں میں ہمیشہ رقیبانہ کشمکش جاری رہتی تھی۔ 603ء کا واقعہ ہے کہ ایک بغاوت کو فرو کرنے کا بہانہ بنا کر ایران نے رومی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ اِس کے بعد رومیوں کو شکست پر شکست ہوتی رہی، یہاں تک کہ 616ء تک یروشلم سمیت روم کی مشرقی سلطنت کا بڑا حصہ ایرانیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چھٹا یا ساتواں سال تھا۔ قرآن نے یہ پیشین گوئی 617ء اور 620ء کے درمیان کسی وقت کی ہے۔ ’’زوال روما‘‘[10] کے مصنف ایڈورڈ گبن کا بیان ہے کہ یہ جس زمانے میں کی گئی، اُس وقت کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از وقوع نہیں ہو سکتی تھی، اِس لیے کہ رومی حکمران ہرقل کے پہلے بارہ سال رومی سلطنت کے خاتمے کا اعلان کر رہے تھے۔ قرآن نے صراحت کے ساتھ فرمایا کہ بہت دن نہیں لگیں گے، یہ زیادہ سے زیادہ اگلی دہائی (بِضْعِ سِنِیْنَ) کے اندر پوری ہو جائے گی۔ چنانچہ ٹھیک اِس اعلان کے مطابق یہ پوری ہو گئی اور مارچ 628ء میں رومی حکمران اِس شان سے قسطنطنیہ واپس آیا کہ اُس کے رتھ کو چار ہاتھی کھینچ رہے تھے اور بے شمار لوگ دارالسلطنت کے باہر چراغ اور زیتون کی شاخیں لیے اپنے ہیرو کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

اِس تعیین و تصریح کے ساتھ اور اِس حتمی اسلوب میں یہ پیشین گوئی نبی صلی اللہ علیہ

[10] زوال روما، ایڈورڈ گبن 2 / 788۔

وسلم کی رسالت کے اثبات کی دلیل کے طور پر کی گئی۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیوں کے ساتھ مذہبی قربت، قرآن کی دعوت اور مسلمانوں کے ساتھ، خاص طور پر حبشہ میں اُن کے طرز عمل کی وجہ سے مسلمان قدرتی طور پر اُن سے ہم دردی رکھتے تھے۔ قرآن نے اُنھیں اطمینان دلایا کہ وہ رنجیدہ خاطر نہ ہوں، اُن کے اہل کتاب بھائی عنقریب غلبہ حاصل کر لیں گے اور یہ پیشین گوئی اُس نبوت کی بھی بہت بڑی دلیل بن جائے گی، جس پر وہ ایمان لائے ہیں، اِس لیے کہ خدا کے سوا کوئی بھی ایسی صراحت اور حتمیت کے ساتھ مستقبل کے بارے میں اِس طرح کی خبر نہیں دے سکتا۔" (البیان 4 / 43-44)

—4—

انفس و آفاق کی
جملہ آیاتِ الٰہی کو بیان کرنے والی آیاتِ قرآنی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد تلاوتِ آیات بھی تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے فرستادے کو قرآن میں مذکور دلائل و براہین سے لیس کر کے مبعوث فرمایا تھا۔ قرآنِ مجید میں اِس کے لیے 'یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس سے مراد اللہ کی آیتوں کو پڑھ کر سنانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قرآنِ مجید کے مندرجات کو پڑھ کر سنایا تو درحقیقت اِسی مقصد کو پورا فرمایا۔ یعنی آپ نے قرآنِ مجید کی صورت میں اُس کلام کو پڑھ کر سنایا، جو اللہ کی قدرت و حکمت، خلق و تدبیر اور دیگر صفات پر انفس و آفاق کے دلائل کو بیان کرتا ہے۔ اِس کا ہر جملہ ایسی دلیل و برہان کی حیثیت رکھتا ہے، جس سے اللہ کی صفات، اُس کے احکام اور اُس کی مرضیات کا علم ہوتا ہے۔ اِسی اعتبار سے قرآنِ مجید کے کلمات و ارشادات بھی بہ منزلۂ آیات ہیں اور اِسی بنا پر اُنھیں آیات قرار دیا گیا ہے۔

'یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ' کے مذکورہ الفاظ سورۂ بقرہ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے طور پر نقل ہوئے ہیں۔ ارشاد ہے:

رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ "پروردگار، اور اُنھی میں سے تو اُن

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ.... (129:2)

کے اندر ایک رسول اٹھا، جو تیری آیتیں اُنھیں سنائے اور اُنھیں قانون اور حکمت سکھائے اور اِس طرح اُنھیں پاکیزہ بنائے...۔"

استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"آیت عربی زبان میں اُس چیز کو کہتے ہیں، جس سے کسی چیز پر دلیل لائی جائے۔ قرآن کا ہر جملہ کسی نہ کسی حقیقت کے لیے دلیل و برہان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس کے لیے آیت کا لفظ اِسی رعایت سے اختیار کیا گیا ہے۔ آیتیں سنانے کے لیے اصل میں 'يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اُس زور و اختیار کو ظاہر کرتے ہیں، جس کے ساتھ اللہ کا رسول اُس کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کو اُس کا فرمان پڑھ کر سناتا ہے اور پھر خدا کی عدالت بن کر اُس کا فیصلہ اُن پر نافذ کر دیتا ہے۔" (البیان 1 / 131)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے سورۂ بقرہ (2) کی آیت 39 کے الفاظ 'وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ' میں لفظِ آیت کے مفہوم کو اِسی پہلو سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"آیت کے اصل معنی اُس نشانی یا علامت کے ہیں، جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ ... کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیات کہا گیا ہے، کیونکہ وہ نہ صرف حق اور صداقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، بلکہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے، اُس کے محض مضامین ہی میں نہیں، اُس کے الفاظ اور اندازِ بیان اور طرزِ عبارت تک میں اُس کے جلیل القدر مصنف کی شخصیت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔"

(تفہیم القرآن 1 / 69)

چنانچہ قرآنِ مجید میں جا بہ جا اِس کی مثالیں موجود ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں انفس و آفاق کے دلائل کو آیات قرار دیا ہے، وہاں قرآن کے فقروں اور جملوں کے لیے بھی یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ احقاف میں ارشاد فرمایا ہے:

وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ ۙ هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ.(7:46)

"اِنھیں جب ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ منکرین حق کے بارے میں، جب کہ وہ اِن کے پاس آگیا ہے، کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔"

تاہم، یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ جب قرآنِ مجید میں یہ لفظ قرآن کے فقروں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے تو اِس کے نتیجے میں آیت کا اصل معنی و مفہوم اِس سے الگ نہیں ہوتا۔ یعنی جب قرآن اپنے متن کے اجزا کے لیے آیت کا لفظ استعمال کرتا ہے تو دلیل اور نشانی کا مفہوم اُس کے اندر برقرار رہتا ہے، وہ اُس سے منفک نہیں ہوتا۔

سورۂ جاثیہ کا درجِ ذیل مقام ملاحظہ کیجیے۔ یہ بات پوری صراحت سے نمایاں ہوگی کہ لفظِ آیت استعمال تو قرآن کی عبارت کے لیے ہوا ہے، مگر اِس میں انفس و آفاق کے دلائل کا مفہوم پوری طرح شامل ہے:

تِلۡكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَقِّ ۚ فَبِاَىِّ حَدِيۡثٍۢ بَعۡدَ اللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ يُؤۡمِنُوۡنَ. وَيۡلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ.

"یہ اللہ کی آیتیں ہیں، جنھیں ہم حق کے ساتھ تمھیں سنا رہے ہیں تو اللہ اور اُس کی آیتوں کے بعد اور کون سی بات ہے، جس پر یہ ایمان لائیں گے! تباہی ہے ہر اُس جھوٹے بداعمال کے لیے۔

يَّسۡمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتۡلٰى عَلَيۡهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسۡتَكۡبِرًا كَاَنۡ لَّمۡ يَسۡمَعۡهَا ۚ فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ. وَ اِذَا عَلِمَ مِنۡ اٰيٰتِنَا شَيۡـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ.

جو اللہ کی آیتیں سنتا ہے، وہ اُس کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں، پھر بھی تکبر کے ساتھ اپنی ضد پر اڑا رہتا ہے، گویا اُس نے وہ سنی ہی نہیں ہیں۔ (یہ اُس کا رویہ ہے)، سو اُسے ایک دردناک

عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ اور ہماری آیتوں میں سے (اِسی طرح) اُسے جب کسی بات کا علم ہوتا ہے تو اُس کو مذاق بنا لیتا ہے۔ یہی ہیں جن کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

مِنۡ وَّرَآئِهِمۡ جَهَنَّمُ ۚ وَ لَا يُغۡنِىۡ عَنۡهُمۡ مَّا كَسَبُوۡا شَيۡـًٔا وَّ لَا مَا اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡلِيَآءَ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ. هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ لَهُمۡ عَذَابٌ مِّنۡ رِّجۡزٍ اَلِيۡمٌ.

(11-6:45)

اِن کے آگے جہنم ہے اور جو کچھ بھی اِنھوں نے (دنیا میں) کمایا ہے، وہ اِن کے ذرا بھی کام آنے والا نہیں ہے اور نہ وہ جن کو اِنھوں نے اللہ کے سوا کارساز بنا رکھا ہے، اِن کے کچھ کام آئیں گے اور اِن کے لیے بڑا عذاب ہے۔ یہ قرآن اصل ہدایت ہے اور جو اپنے پروردگار کی آیتوں کے منکر ہیں، اُن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے، ایسا کہ کپکپی پیدا کر دے۔“

امام امین احسن اصلاحی نے اِس مقام کی جو تفصیل کی ہے، اُس سے آیتِ قرآن کے مفہوم کی حقیقت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”’تِلۡكَ‘ کا اشارہ آفاق و انفس کی اُنھی نشانیوں کی طرف ہے، جو اوپر کی آیات میں مذکور ہوئیں۔ فرمایا کہ اللہ کی توحید، اُس کی قدرت و حکمت اور اُس کے روزِ جزا و سزا کی یہ نشانیاں ہیں، جو اِس قرآن کے ذریعہ سے ہم تم کو، اُن کے صحیح نتائج و لوازم کے ساتھ، پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ یہ نشانیاں اِس قدر واضح ہیں کہ کوئی ذی ہوش اِن کا انکار نہیں کر سکتا۔ اِنھی کے واقعی نتائج و لوازم کو قرآن تسلیم کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ اگر تمھارے یہ

مخالفین اِن نشانیوں کے بدیہی نتائج کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں تو اب اِن سے زیادہ عقل اور دل کو مطمئن کرنے والی اور کون سی چیز ہو سکتی ہے، جس پر ایمان لائیں گے!

'نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَقِّ' میں 'بِالۡحَقِّ' سے مراد وہ قطعی اور حقیقی نتائج ہیں، جو اِن نشانیوں پر غور کرنے سے سامنے آتے ہیں۔ یہ قید اِس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جہاں تک اِن نشانیوں پر غور کرنے کا تعلق ہے، اِن پر غور تو دوسرے بھی کرتے ہیں، لیکن وہ اپنے مخصوص اور نہایت محدود زاویہ سے غور کرتے ہیں، اِس وجہ سے یا تو اُن حقائق تک پہنچ نہیں پاتے، جو اِن کے اندر مضمر ہیں یا پہنچتے تو ہیں، لیکن چونکہ وہ اُن کے نفس کی خواہشوں کے خلاف ہیں، اِس وجہ سے اُن کے اعتراف سے گریز کرتے ہیں۔ مثلاً آسمان و زمین کی نشانیوں پر فلکیات و ارضیات کے ماہرین بھی غور کرتے ہیں۔ انسان کی خلقت پر اناٹومی (ANATOMY) والے بھی تحقیق کرتے ہیں، حیوانات کے مختلف پہلوؤں پر علم الحیوانات والے بھی سر کھپاتے ہیں، رات اور دن کی گردش، بارشوں کے اوقات و اثرات اور ہواؤں کے تغیر و تبدل پر موسمیات والے بھی بہت کچھ ہوا باندھتے ہیں، لیکن اِن سب کا حال اِن کی تنگ نظری کے سبب سے یہ ہے کہ یہ اپنی دور بینوں اور خورد بینوں سے تِل کو تو دیکھ لیتے ہیں، لیکن تل کے اوٹ کا پہاڑ اِن کو نظر نہیں آتا۔ موسمیات والے یہ پیشین گوئی تو کر دیں گے کہ آگے چوبیس گھنٹے موسم گرم و خشک رہے گا اور اُس کی کوئی الٹی سیدھی توجیہ بھی کر دیں گے۔ اکثر حالات میں اُن کی پیشین گوئی صحیح بھی ثابت ہوتی ہے اور بعض حالات میں اُن کی پیش کردہ توجیہ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اُن کی نگاہ صرف ہواؤں کے تصرف کی نوعیت اور اُس کے اثرات کا اندازہ کرنے تک محدود رہ جاتی ہے۔ اِس سے آگے بڑھ کر وہ اِس سوال پر غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے کہ اِن تصرفات کے پس پردہ حقیقی مصرف کون ہے اور اُس کے حقوق و فرائض کیا ہیں! حالانکہ کائنات کے اندر یہ تمام تصرفات و تغیرات جو ہوتے ہیں، یہ اِسی لیے ہوتے ہیں کہ انسان اِس اصل سوال تک پہنچے، اِس کا حل دریافت کرے اور اگر خدا کا کوئی بندہ اُس کو اِس

سوال کا کوئی دل نشین حل بتائے تو اُس کو قبول اور اُس پر عمل کرے۔ قرآن نے اِن نشانیوں کے اِنھی پہلوؤں کو خاص طور پر بے نقاب کیا ہے، جو اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے والے ہیں۔ اِس وجہ سے اِس کو 'نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ' سے تعبیر فرمایا ہے۔

اِس سے ایک بڑی اہم حقیقت یہ واضح ہوئی کہ قرآن کی دعوت جبر یا تحکم پر مبنی نہیں ہے، بلکہ تمام تر آفاق و انفس کے واضح دلائل اور عقل و فطرت کے بینات پر مبنی ہے۔ جو لوگ اِن کو نہیں مانتے، اُن کے نہ ماننے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ مخفی ہیں، بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ اُن کو اپنے نفس کی خواہشوں کے خلاف پاتے ہیں، اِس وجہ سے اُن سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ اِس مرض میں مبتلا ہیں، ظاہر ہے کہ وہ کوئی بھی ایسی بات ماننے کو تیار نہیں ہو سکتے، جو اُن کی خواہش کے خلاف ہے، اگرچہ وہ سورج سے بھی زیادہ روشن ہو کر اُن کے سامنے آئے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ اِس کائنات میں سب سے زیادہ بدیہی، بلکہ ابدہ البدیہیات اللہ اور اُس کی نشانیاں ہیں۔ جو لوگ اُن کے منکر ہیں، وہ کسی بھی حقیقت کو ماننے کے اہل نہیں ہیں۔ وہ محض اپنی خواہشوں کے غلام، اپنے پیٹ اور تن کے پجاری ہیں۔ اِس طرح کے لوگ اگر کچھ نئی نشانیوں اور معجزات کا مطالبہ کریں تو اُن کے مطالبات لائق توجہ نہیں ہیں۔ اِس طرح کے اندھوں کی آنکھیں کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی نہیں کھول سکتا۔"

(تدبر قرآن 7/306-307)

باب دوم

شق قمر کا واقعہ ـــــ قرآنِ مجید کی روشنی میں

قرآنِ مجید میں شق قمر کا واقعہ سورۂ قمر (54) کی ابتدائی آیات میں مذکور ہے۔ اِس کی نوعیت اور حقیقت اور غرض وغایت کو جاننے کے لیے اِن آیات کے معانی و مطالب کو سمجھنا ضروری ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ. وَاِنۡ یَّرَوۡا اٰیَۃً یُّعۡرِضُوۡا وَیَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ. وَکَذَّبُوۡا وَاتَّبَعُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ وَ کُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ. (القمر 54:1-3)

”وہ گھڑی قریب آ گئی، جس سے اِنھیں خبر دار کیا جارہا ہے اور چاند شق ہو گیا۔ (مگر یہ نہ مانیں گے) اور خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اُس سے منہ ہی موڑیں گے اور کہیں گے: یہ تو جادو ہے، جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ (چنانچہ یہی ہوا ہے) اور اِنھوں نے اب بھی جھٹلا دیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہے۔ اور (ہم نے اُسی وقت اِن کو نہیں پکڑا، اِس لیے کہ ہمارے ہاں) ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔“

اِس مقام کو جب قرآنِ مجید کے مجموعی مطالب اور نظم کلام کی روشنی میں پڑھا جائے تو

درجِ ذیل باتیں متعین ہوتی ہیں:

1۔ سورہ کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذارِ عام میں نازل ہوئی ہے۔ سورہ کا موضوع قیامت کا اثبات اور اُس کے حوالے سے انذار و بشارت ہے۔ اِس میں خدا کی دینونت کے ظہور سے استدلال کیا گیا ہے۔

2۔ سورہ کے مضمون سے یہ بھی واضح ہے کہ اِس میں خطاب قریش مکہ سے ہے، جو عذاب کے لیے کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ درجِ بالا آیات میں 'وَاِنۡ یَّرَوۡا اٰیَۃً یُّعۡرِضُوۡا وَیَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ' (اور خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اُس سے منہ ہی موڑیں گے اور کہیں گے: یہ تو جادو ہے، جو پہلے سے چلا آرہا ہے) کے الفاظ بھی اِسی بات کی تصریح کرتے ہیں۔

3۔ سورہ میں قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط اور قوم فرعون کی سرگذشتوں کا حوالہ دیا ہے۔ واضح کیا ہے کہ اِن کی طرف اللہ کے رسول مبعوث ہوئے۔ اُن کے ساتھ اللہ نے اپنی نشانیاں بھی نازل فرمائیں، مگر یہ آخر دم تک جھٹلانے ہی پر کمربستہ رہیں۔ لہٰذا اللہ نے اُن پر اپنا عذاب نازل فرمایا۔ قریش مکہ کا معاملہ اِن سے مختلف نہیں ہے۔ چنانچہ اُن کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہو گا، جو سابقہ اقوام کے مجرمین کے ساتھ ہوا تھا۔ اِس بات کو ایک حتمی پیش گوئی کے طور پر ارشاد فرمایا ہے۔ سورہ کی آیت 45 کے الفاظ ہیں:

سَیُهۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَیُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ. (45:54)

"اِن کا یہ جتھا عنقریب شکست کھا جائے گا اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے ہوں گے۔"

عذاب کی اِس پیش گوئی کے حوالے سے استاذِ گرامی نے لکھا ہے:

"یہ صریح پیشین گوئی ہے، جو ہجرت سے برسوں پہلے کر دی گئی تھی اور جس طرح کی گئی تھی، حرف بہ حرف اُسی طرح پوری ہو گئی۔ قریش پر اتمام حجت کے بعد یہ منظر پہلی مرتبہ معرکۂ بدر کے موقع پر دیکھا گیا۔ خدا کی افواجِ قاہرہ کے مقابل میں اُن کے جتھے اِس

کے بعد کسی میدان میں بھی ٹھیر نہیں سکے، یہاں تک کہ مکہ فتح ہو گیا اور لوگوں نے ہر جگہ اُنھیں اپنی آنکھوں سے پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہوئے دیکھ لیا۔"(البیان 5/ 91)

4۔ سورہ کا آغاز 'اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ' (قیامت کی گھڑی قریب آگئی) کے الفاظ سے ہوا ہے۔ استاذِ گرامی کے الفاظ میں 'السَّاعَةُ' سے یہاں قیامت کی گھڑی مراد ہے، "جو رسول کے مکذبین کے لیے اُس عذاب سے شروع ہو جاتی ہے، جو اُس کی تکذیب پر اصرار کے نتیجے میں اُن پر لازماً آتا ہے۔"[11] یعنی اُن کے اخروی فیصلے کا نفاذ اِسی دنیا میں ہو جاتا ہے اور اُن کی سزا بھی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔ آخرت میں اُن کا مزید حساب کتاب نہیں ہوتا۔ وہ پہلے دنیوی عذاب جھیلتے ہیں، پھر قبر کے عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر اُسی کے تسلسل میں دوزخ کا ایندھن بنتے ہیں۔ کفارِ قریش کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر وہ تکذیب اور تکفیر کی اِسی روش پر قائم رہے تو اُن کا انجام بھی یہی ہو گا۔ عنقریب اُن کا فیصلہ صادر ہو جائے گا اور اُن کے سلسلۂ عذاب کا آغاز ہو جائے گا۔

5۔ 'وَانْشَقَّ الْقَمَرُ' کے الفاظ چاند کے شق ہونے یا اُس کے پھٹ جانے کے بارے میں بالکل صریح ہیں۔ 'انْشَقَّ' ماضی کا فعل ہے، جو کسی عمل کے وقوع اور تکمیل پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی شق ہونے کا فعل واقع ہو کر پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اِس سے آگے متصل آیت بھی اِسی بات کی تاکید و توثیق کر رہی ہے کہ یہ مستقبل میں ہونے والا کوئی واقعہ[12] نہیں ہے، جسے ابھی ظہور پذیر ہونا ہے، بلکہ ایسا واقعہ ہے، جو واقع ہو چکا ہے۔ اگلی آیت یہ ہے: 'وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ' (اور خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اُس سے منہ ہی موڑیں گے اور کہیں گے: یہ تو جادو ہے، جو پہلے سے چلا آ رہا ہے)۔

---

[11] البیان 5/ 82۔

[12] بعض علما کے نزدیک یہ مستقبل کے واقعے کا بیان ہے۔ اُن کے خیال میں ماضی کا صیغہ اُس کی قطعیت کو نمایاں کرنے کے لیے آیا ہے۔

استاذِ گرامی بیان کرتے ہیں:

''وَاِنۡ يَّرَوۡا اٰيَةً يُّعۡرِضُوۡا وَيَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ''، ''اور خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اُس سے منہ ہی موڑیں گے اور کہیں گے: یہ تو جادو ہے، جو پہلے سے چلا آ رہا ہے'' کا جملہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ شق قمر کا یہ واقعہ مستقبل کی کوئی خبر نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آنے والا ایک واقعہ ہے، جس سے قرآن نے عذاب اور قیامت کے وقوع پر استدلال کیا ہے۔ اِس لیے کہ 'اِنۡشَقَّ الۡقَمَرُ' کے معنی اگر یہ کیے جائیں کہ چاند شق ہو جائے گا تو اِس کے بعد یہ جملہ بالکل بے جوڑ ہو جاتا ہے۔'' (البیان 5/ 83)

6۔ اِسی طرح اِسے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے کسی زمانے سے بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ آیت 2 سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ اِس کے مخاطبین قریش ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ وہ اِس نوعیت کی نشانیوں کو جادو قرار دے کر جھٹلانے کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

شق قمر کے واقعے کی نوعیت

شق قمر کو قرآنِ مجید نے 'آیۃ' سے تعبیر کیا ہے۔ اِس کے معنی و مصداق اور اطلاق و استعمال کے حوالے سے پہلے باب میں مفصل بحث کی گئی ہے۔ اِس بحث کی نوعیت اگلے مباحث کے فہم میں گویا مقدمے کی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے علم و استدلال اور تحلیل و تجزیہ میں اِسے اساس کی حیثیت حاصل ہے۔ اِس بنا پر مناسب ہو گا کہ گذشتہ باب کا خلاصہ سامنے رکھ لیا جائے۔ یہ چند نکات میں درجِ ذیل ہے:

* 'آیۃ' عربی زبان کا معروف لفظ ہے۔ اِس کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔
* یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کی نسبت سے بیان ہو تو اِس سے مراد انفس و آفاق کی وہ نشانیاں ہوتی ہیں، جو اُس کی مختلف صفات کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

* قرآنِ مجید جب انسانوں کو اللہ کی صفات کے بارے میں توجہ دلانا چاہتا ہے تو وہ اِنھی آیات کو بہ طورِ دلیل پیش کرتا ہے اور اِس طرح اُن کے لیے تذکیر و ترغیب، تہدید و تخویف اور تنبیہ و تعذیب کا سامان کرتا ہے۔

* اِس اصطلاحی مفہوم میں یہ لفظ قرآنِ مجید میں چار مختلف مصداقات کے لیے استعمال ہوا ہے۔

ایک،—— انفس و آفاق میں معمول کے مطابق ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی کے لیے—— جو انفس و آفاق میں ظاہر و باہر ہیں اور جن کا تعلق اللہ کی قدرت کے عادی امور سے ہے۔ اللہ کا انسان کو مٹی کے خمیر سے تخلیق کرنا یا سورج اور چاند کو ایک قانون کا پابند کرنا یا آسمان سے پانی برسا کر مردہ زمین کے اندر زندگی پیدا کرنا اِسی نوعیت کی آیات ہیں۔

دوسرے،—— انفس و آفاق میں معمول کے خلاف ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی کے لیے —— جو مافوق الفطرت اور خارقِ عادت ہیں اور اللہ کے براہِ راست حکم سے یا کارکنانِ قضاو قدر کے ذریعے سے واقع ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانۂ رسالت میں بنی اسرائیل پر من و سلویٰ اترنا، صحراے سینا میں اُن پر مستقل بادلوں کا سایہ رہنا، حضرت مسیح علیہ السلام کا بن باپ کے پیدا ہونا اور گہوارے میں کلام کرنا اِسی کی مثالیں ہیں۔

تیسرے،—— انفس و آفاق کی خلافِ معمول ظاہر ہونے والی اُن آیاتِ الٰہی کے لیے —— جو مافوق الفطرت اور خارقِ عادت ہیں اور اللہ کے حکم پر اُس کے نبیوں کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اِنھی کو مذہبی اصطلاح میں ''معجزہ'' کہا جاتا ہے۔ اِس کے نظائر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا سانپ بننا، اُس کی ضرب سے بارہ چشموں کا پھوٹنا، حضرت مسیح علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا اور رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر کلام الٰہی کا جاری ہونا شامل ہیں۔

چوتھے،—— انفس و آفاق میں حسبِ معمول اور خلافِ معمول ظاہر ہونے والی آیاتِ

الٰہی کو بیان کرنے والی آیاتِ قرآنی کے لیے ——جو قرآن کے بین الدفتین درج ہیں اور اُس کی سورتوں کے فقروں کے طور پر تلاوت کی جاتی ہیں۔

اِن نکات کی روشنی میں اب سوال یہ ہے کہ سورۂ قمر میں لفظ 'آیۃ' مذکورہ چار اطلاقات میں سے کس اطلاق کو قبول کرتا ہے؟

اگر ہم اِسے قرآن کے جملے یا آیت کے مفہوم میں لینا چاہیں تو ظاہر ہے کہ اِس کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ 'وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ' کا جملہ، بلاشبہ قرآن کی آیت ہے، مگر اِس جملے کے اندر استعمال ہونے والے لفظ 'آیۃ' کا مطلب آیت قرآنی ہرگز نہیں ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ قرآن کے کسی فقرے یا بیان کے لیے نہیں، چاند شق ہونے کے واقعے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اِسی طرح اگر اِس کا اطلاق انفس و آفاق کی معمول کے مطابق ظاہر ہونے والی نشانیوں پر کیا جائے تو یہ بھی درست نہ ہو گا، کیونکہ یہ معمول کا واقعہ نہیں ہے۔ معلوم انسانی تاریخ میں یہ واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا ہے۔ چاند کا طلوع و غروب، اُس کا عروج و محاق، اُس کی ماہِ نو، ماہِ کامل اور ماہِ مشبہ کی مختلف صورتیں، اُس کا جزوی یا مکمل گرہن، اُس کی سرخی، سفیدی اور سیاہی، اُس کی گردش سے مہ و سال کا تعین، اُس کی کشش سے سمندر کا مدو جزر، اُس کی دل کش روشنی اور اُس روشنی میں رات کے مسافروں کے لیے رہنمائی کا سامان، یہ سب اللہ کی آیات ہیں، اُس کی عظیم نشانیاں ہیں، مگر یہ سب روز مرہ اور معمول کے واقعات ہیں۔ اِن کے وقوع میں تسلسل اور تواتر ہے۔ انسان اِن سے مانوس اور مربوط ہوتے ہیں۔ یہ آفاق کی عاداتِ مستمرہ ہیں، خوارقِ عادات نہیں ہیں۔ اِن سب کے برعکس شق قمر ایک خلاف معمول اور خارقِ عادت واقعہ ہے، اِس لیے آیت کے اِس مفہوم کا بھی اِس پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک اُن آیات کا تعلق ہے، جو معجزات و خوارق کی صورت میں انبیا کے توسط سے ظاہر ہوتی ہیں تو اُن کے زمرے میں بھی اِس واقعے کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کی وجہ یہ ہے

کہ اِس میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا توسط اختیار نہیں کیا گیا۔ یعنی نہ آپ نے اپنی زبان سے کوئی الفاظ صادر فرمائے، نہ دستِ مبارک کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے ہونے کا حکم دیا اور نہ اُس کی جانب کسی چیز کو پھینکا۔ ایسی کوئی صورت ہوتی تو بلاشبہ، اِس واقعے کا شمار اُن آیات میں ہوتا، جو اللہ کے اذن پر انبیا کے ہاتھ سے ظاہر ہوتی ہیں۔

اب ایک ہی صورت باقی ہے کہ اِسے آیاتِ الٰہی کی اُس نوعیت پر محمول کیا جائے، جو خارقِ عادت تو ہے، مگر اللہ کی طرف سے براہِ راست ظاہر ہوئی ہے۔

چنانچہ درست تاویل یہی ہے کہ یہ واقعہ ایسی غیر معمولی نشانی ہے، جو اللہ کے براہِ راست حکم سے ظاہر ہوئی اور اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط کو اختیار نہیں کیا گیا۔ یعنی اِس کا شمار اُسی طرح کی نشانیوں میں ہوتا ہے، جیسی اِس سے پہلے بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے زمانے میں ظاہر کی گئیں۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اِسی طرح کی نشانیاں دکھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ سورۂ حٰم السجدہ اور سورۂ نمل میں بیان ہوا ہے۔ حٰم السجدہ میں اعلان فرمایا ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ.... (53:41)

”(تم مطمئن رہو، اے پیغمبر، اور یہ بھی متنبہ ہو جائیں)، اِنھیں ہم عنقریب اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود اِن کے اندر بھی، یہاں تک کہ اِن پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن بالکل حق ہے...۔“

سورۂ نمل میں ارشاد ہے:

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ط وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا

”اور کہہ دو کہ شکر اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ عنقریب اپنی نشانیاں تمھیں

تَعۡمَلُوۡنَ.(93:27)	دکھائے گا اور تم اُنھیں پہچان لو گے اور جو کچھ تم کر رہے ہو، تمھارا رب اُس سے بے خبر نہیں ہے۔“

امام امین احسن اصلاحی نے حٰم السجدہ کے اعلان کو ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور مکذبین قرآن کے لیے تہدید و وعید“ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ اِس کی وضاحت میں اُنھوں نے لکھا ہے:

”مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ قرآن کو، اُس کے دلائل کی بنیاد پر، ماننے کے لیے تیار نہیں، بلکہ اُس کی تصدیق کے لیے ہماری نشانیاں ہی دیکھنے پر مصر ہیں تو عنقریب وہ وقت بھی آ رہا ہے، جب مکہ کے اطراف میں بھی اور خود مکہ میں، قریش کے اندر بھی، اِس کی حقانیت کی ایسی نشانیاں ظاہر ہوں گی کہ یہ پکار اٹھیں گے کہ بے شک، قرآن بالکل حق ہے۔ ’آیات‘ سے مراد غلبۂ حق اور ہزیمتِ باطل کے وہ آثار و شواہد ہیں، جن کی قرآن نے پیشین گوئی کی ہے۔ یہ پیشین گوئی اِس سورہ میں بھی پیچھے تاریخی دلائل کی روشنی میں گزر چکی ہے۔ ابتداءً تو قریش کے لیڈروں نے اِن باتوں کو تعلّی پر محمول کر کے اِن کا مذاق اڑایا، لیکن جب مدینہ میں اور خود مکہ کے اندر اور اُس کے اطراف میں، یہاں تک کہ خود قریش کے اچھے لوگوں کے اندر بھی اسلام جڑ پکڑنے لگا، تب اُن کو اور اُن کے پشت پناہوں کو کچھ تنبہ ہوا۔ بالآخر ہجرت کے بعد غلبۂ اسلام کے ایسے واقعات پیش آئے کہ قریش تو درکنار روم و فارس کے لیے بھی اسلام کے مقابل میں ٹکنا ناممکن ہو گیا۔“(تدبر قرآن 7/128-129)

استاذِ گرامی سورۂ نمل کی مذکورہ آیت کے تحت لکھتے ہیں:

”یعنی تمھیں پتا چل جائے گا کہ یہ وہی نشانیاں ہیں، جن کے بارے میں میں نے تمھیں خبردار کر دیا تھا۔ چنانچہ معلوم ہے کہ ہجرت کے بعد یہ سب نشانیاں ظاہر ہو گئیں اور لوگوں نے بہ چشم سر دیکھ لیا کہ خدا کے پیغمبر نے کتنی سچی باتیں بتائی تھیں۔“

(البیان 3/581)

چاند کو دو ٹکڑے کرنا، در حقیقت اُسی فیصلے کا اظہار تھا، جس کا اعلان پہلے کر دیا گیا تھا۔ یہ آفاق میں ظاہر ہونے والی نہایت غیر معمولی اور عظیم الشان نشانی تھی۔ اِس کی حیرت انگیزی، اِس کی شان، اِس کے ہول اور اِس کے رعب و دبدبے نے اِسے ایک عظیم آیتِ الٰہی کے طور پر نمایاں کیا تھا۔ نوعیت کے اعتبار سے اِس کا شمار اُن آیات میں ہوتا ہے، جو اللہ کی طرف سے براہِ راست ظاہر کی گئی تھیں اور جن میں انبیا کے توسط کو اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ گویا یہ اُسی قسم کی نشانیوں میں سے ہے، جیسی اِس سے پہلے بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے زمانے میں ظاہر کی گئیں۔ اِن کی مثالیں من و سلویٰ کا اترنا، بدلیوں کا سایہ فگن ہونا، کوہِ طور کا معلق ہونا، سیدنا مسیح علیہ السلام کا بن باپ کے تخلیق پانا ہیں۔

شق قمر کے واقعے کا مقصد

قرآن سے یہ بھی واضح ہے کہ شق قمر کی نشانی کفارِ قریش کے لیے تھی اور اِس کا مقصد اُنھیں 'الساعة'، یعنی قیامت کی گھڑی کے بارے میں متنبہ کرنا تھا۔ رسول کے مکذبین کے لیے قیامت کی یہ گھڑی اُس عذاب سے شروع ہوتی ہے، جو اُس کی تکذیب پر اصرار کے نتیجے میں دنیا ہی میں برپا ہو جاتا ہے اور اِس گھڑی کا اتمام اُس وقت ہو گا، جب صور پھونکا جائے گا اور قیامت واقع ہو جائے گی۔

اِس عذاب کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے انبیا کی دعوت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اِس کی تفصیل اِس طرح ہے کہ اللہ کے نبی دعوت الی اللہ اور قیامت کے انذار و بشارت کے لیے دنیا میں آتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے مخاطبین کو اللہ پروردگارِ عالم کی طرف بلاتے ہیں اور ماننے والوں کو قیامت میں اچھے انجام کی خوش خبری سناتے ہیں اور نہ ماننے والوں کو برے انجام سے خبر دار کرتے ہیں۔ یہ نبیوں کا منصبی فریضہ ہے۔ اُن کے اِس فریضے کو قرآن نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ.... (البقرہ2:213)

”لوگ ایک ہی امت تھے۔ پھر (اُن میں اختلاف پیدا ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے، بشارت دیتے اور انذار کرتے ہوئے...۔“

نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ حکم اِن لفظوں میں آیا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا. وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. (الاحزاب33:45-46)

”اے نبی، (تم بھی بے پروا ہو جاؤ)، ہم نے تمھیں گواہی دینے والا اور خوش خبری سنانے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور اللہ کے اذن سے اُس کی طرف دعوت دینے والا اور (لوگوں کو تاریکیوں سے نکالنے کے لیے) ایک روشن چراغ۔“

اِن نبیوں میں سے بعض ہستیوں کو اللہ ”نبوت“ کے ساتھ ”رسالت“ کے منصب پر بھی فائز کرتے ہیں۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ نبی اپنے مخاطبین پر حق کو آخری درجے میں واضح کر کے اُن پر اللہ کی حجت تمام کر دے۔ آسمان کی عدالت زمین پر لگ جائے اور جھٹلانے والوں کے اخروی اور حتمی انجام کو اِسی دنیا میں طے اور عملاً نافذ کر دیا جائے۔ گویا رسول کے مکذبین کے لیے ایک قیامتِ صغریٰ برپا ہو اور اُن کی جنت اور جہنم کا فیصلہ اِسی زندگی میں ہو جائے۔ قرآن میں اِن رسولوں کی جو سرگذشتیں بیان ہوئی ہیں، اُن سے واضح ہے کہ حضرت نوح، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت ہود، حضرت شعیب، حضرت موسیٰ علیہم السلام کے منکرین کے ساتھ یہی معاملہ ہوا۔ وہ آفاتِ سماوی کے ذریعے سے نیست و نابود کیے گئے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مکذبین کو بھی اِسی قانون کے تحت آپ کے صحابہ کی

تلواروں کے ذریعے سے ہلاک کیا گیا۔

اِس تناظر میں دیکھیے، سورہ کے آغاز میں فرمایا ہے کہ قریش کے منکرین کے لیے 'الساعة'، یعنی عذاب کی گھڑی قریب آ گئی، جس کے بارے میں اللہ کا رسول اُنھیں متنبہ کر رہا تھا اور اِس کی نشانی کے طور پر اللہ نے چاند کو شق کر کے دکھا دیا ہے۔ اِس تمہید کے بعد انبیاے سابق کی سرگذشتوں کا حوالہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ اُن کے مخاطبین نے بھی اُنھیں جھٹلایا تھا تو اللہ نے اُنھیں نیست و نابود کر دیا۔ چنانچہ قوم نوح نے جھٹلایا تو اُسے پانی میں غرق کر دیا، عاد نے جھٹلایا تو اُنھیں بادِ تند سے ہلاک کر دیا اور اُن کی لاشیں کھجور کے کھوکھلے تنوں کی طرح ہو گئیں، جو ہوا کے زور سے ادھر ادھر لڑھک رہے تھے، ثمود نے جھٹلایا تو اللہ نے اُن کے لیے اونٹنی کو نشانی بنا دیا اور جب اُنھوں نے اُس کی کونچیں کاٹ دیں تو اللہ نے اُنھیں ہول ناک کڑک اور ہیبت ناک چیخ سے ہلاک کر دیا اور اُن کی آبادیوں کو بالکل پامال کر ڈالا، قوم لوط نے تکذیب کی تو اُنھیں پتھر برسانے والی ہوا سے تباہ و برباد کر دیا، قوم فرعون نے جھٹلایا تو اُسے بھی زبردست قوت سے دبوچ کر فنا کر ڈالا۔ اِن تاریخی شہادتوں کو پیش کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اگر اِن قوموں کے جھٹلانے کا نتیجہ عذاب کی صورت میں نکلا ہے تو تمھارے جھٹلانے کا نتیجہ مختلف کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر تم کچھ دیر اور اِسی روش پر قائم رہے تو سمجھ لو تمھارے عذاب کا وقت بھی قریب آ لگا ہے۔ شق قمر کا غیر معمولی واقعہ اِسی کی ایک نشانی ہے۔ یہ اِس حقیقت کا پتا دیتی ہے کہ جو قادرِ مطلق چاند جیسے عظیم کرّے کو دو ٹکڑے کر کے پھر جوڑ سکتا ہے، اُس کے لیے تمھارے جوڑ بند الگ کر کے دوبارہ جوڑنا چنداں مشکل نہیں ہے۔ چنانچہ آگاہ رہو کہ تمھاری قیامتِ صغریٰ کی ساعت بھی قریب ہے اور اُسی کے تسلسل میں قیامت کبریٰ کی ساعت بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ سورہ کے آخری حصے میں ارشاد فرمایا ہے:

اَكُفَّارُكُمۡ خَيۡرٌ مِّنۡ اُولٰٓئِكُمۡ اَمۡ لَكُمۡ "(قریش کے لوگو، پھر) تمھارے یہ

بَرَآءَةٌ فِی الزُّبُرِ. اَمْ یَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِیْعٌ مُّنْتَصِرٌ. سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ. بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰی وَاَمَرُّ.

(القمر 54:43-46)

منکرین کیا اُن سے کچھ بہتر ہیں یا صحیفوں میں تمھارے لیے کوئی معافی لکھی ہوئی ہے؟ کیا اِن کا زعم ہے کہ ہم ایسا جتھا ہیں، جو مقابلہ کر لے گا؟ (سن لو)، اِن کا یہ جتھا عنقریب شکست کھا جائے گا اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے ہوں گے۔ نہیں، بلکہ اِن سے جو وعدہ ہے، اُس کے پورا ہونے کا اصل وقت تو قیامت کا دن ہے اور قیامت کا دن (اِن منکروں کے لیے) بڑا سخت اور بڑا ہی تلخ ہو گا۔"

امام امین احسن اصلاحی نے سورہ کے آغاز اور اختتام میں لفظ 'اَلسَّاعَةُ' کی جس طرح وضاحت کی ہے، اُس سے شق قمر کا مقصد پوری طرح واضح ہو گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"'اَلسَّاعَةُ' سے مراد فیصلہ اور عذاب کی گھڑی ہے۔... یہ بات ہم جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں کہ اللہ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک تو اُس عذاب سے جو اِس دنیا میں لازماً قوم پر آ کے رہتا ہے، اگر وہ رسول کے انذار کو خاطر میں نہیں لاتی، بلکہ اُس کی تکذیب پر اڑ جاتی ہے۔ دوسرے اُس عذاب سے جو آخرت میں پیش آئے گا۔ اِن دونوں عذابوں میں فرق صرف آغاز و تکمیل یا تمہید اور خاتمہ کا ہے۔ رسول کی تکذیب کے عذاب میں جو قوم پکڑی جاتی ہے، وہ درحقیقت آخرت کے عذاب ہی کے لیے پکڑی جاتی ہے، اِس وجہ سے لفظ 'اَلسَّاعَةُ' بسا اوقات اِن دونوں ہی عذابوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اِس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ہر قوم جس کے اندر رسول آ گیا، اُس کے فیصلہ کی گھڑی سر پر آ گئی۔ گویا 'اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ' کا اسلوب بیانِ مبالغہ کا اسلوب

نہیں، بلکہ یک سر بیانِ حقیقت ہے۔

'وَانْشَقَّ الْقَمَرُ'۔ یہ علامت بیان ہوئی ہے عذاب کی گھڑی کے قریب آنے کی۔ اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کا حوالہ ہم اِس کتاب میں جگہ جگہ دے چکے ہیں کہ یوں تو اِس زمین و آسمان کے چپہ چپہ پر اِس کی قدرت و حکمت کی نشانیاں موجود ہیں اور آئے دن نئی نئی نشانیاں بھی ظاہر ہوتی رہتی ہیں، لیکن رسولوں کی بعثت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ خاص طور پر ایسی نشانیاں ظاہر فرماتا ہے، جن سے رسول کے انذار اور اُس کے دعوائے رسالت کی صداقت ظاہر ہوتی ہے...

اِن نشانیوں کا مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، رسول کے انذار کو تقویت پہنچانا ہوتا ہے۔ رسول جن باتوں کی منادی زبان سے کرتا ہے، اُس کی تائید کے آثار و شواہد اِس کائنات میں بھی، مختلف شکلوں میں، ظاہر ہوتے ہیں تاکہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت اچھی طرح پوری ہو جائے۔ اِسی طرح کی ایک نشانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار کی تائید کے لیے چاند کے پھٹنے کی صورت میں ظاہر ہوئی تاکہ منکرین عذاب و قیامت پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قرآن اُن کو جو ڈرا رہا ہے کہ زمین اُس دن ہلا دی جائے گی، پہاڑ پاش پاش ہو کر فضا میں اڑنے لگیں گے، سمندر ابل پڑیں گے، سورج تاریک ہو جائے گا؛ یہ باتیں اُن کو مرعوب کرنے کے لیے نہیں بیان ہوئی ہیں، بلکہ یہ حقائق ہیں، جو ایک دن پیش آ کے رہیں گے اور یہ بعید از امکان بھی نہیں ہیں، اِن کے شواہد کسی نہ کسی شکل میں اِس دنیا میں بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔...

کفارِ قیامت کو جو بہت بعید از عقل چیز خیال کرتے تھے، اِس کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ یہ ساری کائنات ایک دن بالکل درہم برہم ہو جائے۔ پہاڑوں سے متعلق اُن کا جو سوال قرآن میں نقل ہوا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن چیزوں کو وہ بالکل اٹل، غیر متزلزل اور غیر فانی سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شق قمر کی نشانی دکھا کر اُن کو بتایا کہ اِس کائنات کی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی، خواہ وہ کتنی ہی عظیم ہو، نہ خود

مختار ہے، نہ غیر فانی، نہ غیر متزلزل، بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے۔ وہ جب چاہے گا، اُن سب کو درہم برہم کر کے رکھ دے گا۔...

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اوپر والی آیت (اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ) میں اُس عذاب وہزیمت کا ذکر تھا، جس سے رسولوں کے مکذبین کو لازماً اِسی دنیا میں سابقہ پیش آتا ہے۔ اِس آیت (بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَ السَّاعَةُ اَدْهٰی وَ اَمَرُّ) میں اُس عذاب کا حوالہ ہے، جو اصل روزِ حساب، یعنی قیامت میں اُن کے سامنے آئے گا اور جو بڑا ہی کٹھن ہو گا۔ اِس کتاب میں جگہ جگہ ہم اِس سنت الٰہی کا حوالہ دے چکے ہیں کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والے اِس دنیا میں بھی لازماً شکست کھاتے ہیں اور آخرت تو اُن کی رسوائی کی جگہ ہے ہی۔"

(تدبر قرآن 8/90-91، 113)

باب سوم

شق قمر کا واقعہ ـــــ احادیث و آثار کی روشنی میں

شق قمر کا واقعہ اصلاً قرآنِ مجید میں مذکور ہے۔ اُس نے اِس قسم کی نشانیوں کے پس منظر اور خاص اِس واقعے کی نوعیت اور غرض و غایت کو پوری صراحت سے واضح کیا ہے۔ چنانچہ اِس واقعے کی تشریح و تفصیل میں اُسی کے مندرجات کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ تاہم، اِس کا ذکر متعدد صحابۂ کرام نے بھی کیا ہے۔ اِن میں حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت جبیر بن مطعم، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم نمایاں ہیں۔ اِن میں سے بعض عینی شاہد ہیں اور بعض نے اِسے دوسروں کی شہادت پر روایت کیا ہے۔ یہ روایات احادیث و آثار کی صورت میں بخاری، مسلم، ترمذی، احمد، ابو عوانہ، ابو داؤد طیالسی، عبدالرزاق، ابن جریر، بیہقی، طبرانی، ابن مردویہ اور ابو نعیم اصفہانی کے مجموعوں میں متعدد اور مختلف سندوں کے ساتھ منقول ہیں۔ اِن روایات کو راویوں کے مشاہدے کے اعتبار سے دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1۔ شق قمر کا مشاہدہ کرنے والے اصحاب کی روایات

2۔ شق قمر کا مشاہدہ نہ کرنے والے اصحاب کی روایات

ذیل میں اِسی ترتیب سے مذکورہ روایات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ البتہ، اِس کے مطالعے سے پہلے شق قمر کے زمانے کا تعین ضروری ہے۔

شق قمر کے وقوع کا زمانہ

شق قمر کا واقعہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہجرت سے پہلے رونما ہوا تھا۔ تاریخ و سیرت اور حدیث و تفسیر کے علما کا اِس پر اتفاق ہے۔ اُن کے اندازے کے مطابق یہ واقعہ ہجرت سے تقریباً پانچ سال پہلے مکہ مکرمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں پیش آیا تھا۔ آپ اُس وقت منیٰ میں تھے۔ اِس موقع پر متعدد صحابۂ کرام اور کفارِ قریش نے اِس کا مشاہدہ کیا تھا۔

شارح بخاری حافظ ابنِ حجر عسقلانی ''فتح الباری'' میں انشقاق القمر کی روایتوں کے تحت لکھتے ہیں:

قال: انشقّ القمر بمكة يعني: أن الانشقاق كان وهم بمكة قبل أن يهاجروا إلى المدينة. (184/7)	''ایک روایت میں راوی (حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) نے بیان کیا ہے کہ شق قمر کا واقعہ مکہ میں رونما ہوا تھا۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ جب چاند دو ٹکڑے ہوا تو وہ مدینہ کی طرف ہجرت سے پہلے مکہ میں تھے۔''

''المواہب اللدنیہ'' میں علامہ احمد بن محمد قسطلانی نے لکھا ہے:

كان بمكة قبل الهجرة بنحو خمس سنين. (254/2)	''یہ واقعہ مکہ مکرمہ میں ہجرت سے تقریباً پانچ سال پہلے رونما ہوا۔''

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اِسی تاریخ کی تصریح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تمام روایات کو جمع کرنے سے اِس کی جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں، وہ یہ ہیں کہ یہ ہجرت سے تقریباً پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قمری مہینے کی چودھویں شب تھی۔ چاند ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ یکایک وہ پھٹا اور اُس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور

دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا۔ یہ کیفیت بس ایک ہی لحظہ رہی اور پھر دونوں ٹکڑے باہم جڑ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت منیٰ میں تشریف فرما تھے۔"

(تفہیم القرآن 5/229)

سید سلیمان ندوی نے بیان کیا ہے کہ یہ واقعہ کفارِ قریش کے لیے آخری نشانِ ہدایت تھا۔ اتنی بڑی نشانی کو دیکھ کر بھی جب قریش ایمان نہ لائے تو اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ اب حجت تمام ہو گئی ہے، اِس لیے اِس قوم کو چھوڑ کر ہجرت کر جایئے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہدایت کی اِن نشانیوں میں کفارِ مکہ کے لیے سب سے آخری اور فیصلہ کن نشان شق قمر کا تھا، جس کے بعد آیاتِ ہلاکت کا آغاز ہونے والا تھا... ہجرت سے پہلے شق قمر کا نشان ظاہر ہوا اور اُس کو دیکھ کر بھی جب قریش کے رؤسا اسلام نہ لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے ہجرت کا حکم ہوا اور ہلاکت کے عذاب کے نازل ہونے کا وقت قریب آ گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اسرارِ نبوت کے جو محرم تھے، وہ پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ یہ ہجرت قریش کی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ مستدرک حاکم (جلد 3، ص: 7) اور مسند ابن حنبل (جلد 1، ص: 216) میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکلے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا (انا للہ) مکہ والوں نے اپنے پیغمبر کو نکال دیا، اب یہ ضرور ہلاک ہو جائیں گے، چنانچہ (أُذِنَ لِلَّذِيْنَ) والی قتال کی آیت نازل ہوئی۔"

(سیرت النبی 3/172-173)

شق قمر کا مشاہدہ کرنے والے اصحاب کی روایات

واقعے کی تفصیلات اور روایات کے بعض اشارات سے قرین قیاس یہی ہے کہ اِس موقع پر صحابۂ کرام کی ایک معتد بہ تعداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم راہ موجود تھی۔ تاہم، جن اصحاب نے اِسے روایت کیا ہے، اُن میں سے عینی شاہدین کی تعداد تین ہے۔ یہ حضرت

عبد اللہ بن مسعود، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہم ہیں۔ اِن کی روایات درجِ ذیل ہیں:

1۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مکی صحابی ہیں۔ اِن کا شمار ابتدائی ایمان لانے والوں میں ہوتا ہے۔ شق قمر کے موقع پر اِن کی عمر تقریباً چوبیس پچیس سال تھی۔ اِس واقعے کی روایات میں اِنھی کی روایت کو بنیادی روایت کی حیثیت حاصل ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ واقعے کے عینی شاہد ہیں اور اُنھوں نے اِس کے وقوع کے زمانے اور مقام، دونوں کا تعین کیا ہے۔ اِسی طرح اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعے پر ردِ عمل بھی مذکور ہے۔ یہ روایت کم و بیش اُن تمام محدثین نے نقل کی ہے، جنھوں نے انشقاق القمر کو اپنی کتابوں میں موضوع بنایا ہے۔ اِس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

* بخاری و مسلم کے مختلف طرق سے واضح ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ[13] میں موجود تھے۔
* اُنھوں نے دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔
* ایک ٹکڑا الگ ہو کر پہاڑ کے دوسری جانب چلا گیا۔
* نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ گواہ رہنا۔

بیہقی کے طریق میں یہ اضافہ ہے کہ اِس واقعے پر کفار نے تبصرہ کیا کہ لگتا ہے کہ محمد صلی

---

[13] دو پہاڑیوں کے درمیان یہ ایک وسیع میدان ہے، جس کا فاصلہ مکہ سے تقریباً پانچ کلو میٹر ہے۔ 8 / ذوالحجہ کو مکہ سے آنے کے بعد اور 10 / ذوالحجہ کو عرفات سے واپس آکر حجاج یہیں قیام کرتے اور حج کے باقی مناسک پورے کرتے ہیں۔

اللہ علیہ وسلم نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔ لہٰذا باہر سے آنے والوں کا انتظار کرو۔ اگر وہ تصدیق کریں تو اِس کا مطلب ہے کہ واقعہ حقیقی ہے۔ جب باہر سے آنے والوں سے پوچھا گیا تو اُنھوں نے بتایا کہ وہ بھی اِس کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔

روایت کے چند نمایندہ طرق درجِ ذیل ہیں:

حدثنا عبدان، عن ابی حمزة عن الاعمش، عن إبراهيم، عن ابی معمر، عن عبد الله رضی الله عنه، قال: انشق القمر ونحن مع النبی صلى الله عليه وسلم بمنى، فقال: اشهدوا وذهبت فرقة نحو الجبل. (بخاری، رقم 3869)

”ہم سے عبدان نے بیان کیا، اُن سے ابوحمزہ محمد بن میمون نے، اُن سے اعمش نے، اُن سے ابراہیم نے، اُن سے ابومعمر نے اور اُن سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جس وقت چاند کے دو ٹکڑے ہوئے تو ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ کے میدان میں موجود تھے۔ آپ نے فرمایا تھا: لوگو، گواہ رہنا۔ اور چاند کا ایک ٹکڑا دوسرے سے الگ ہو کر پہاڑ کی طرف چلا گیا تھا۔“

حدثنا ابو بكر بن ابی شيبة، وابو كريب، وإسحاق بن إبراهيم جميعًا، عن ابی معاوية. وحدثنا عمر بن حفص بن غياث، حدثنا ابی كلاهما، عن الاعمش. وحدثنا منجاب بن الحارث التميمی واللفظ له اخبرنا ابن مسهر، عن الاعمش، عن إبراهيم عن

”ہم سے ابو بکر بن ابی شیبہ، ابو کریب اور اسحاق بن ابراہیم نے بیان کیا، اُن سے ابومعاویہ نے بیان کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم سے عمر بن حفص بن غیاث نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ اِن دونوں کو میرے والد نے الاعمش کے حوالے سے بیان کیا۔ اور ہم سے

ابی معمر، عن عبد اللہ بن مسعود، قال: بینما نحن مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بمنی إذا انفلق القمر فلقتین، فکانت فلقة وراء الجبل وفلقة دونه فقال لنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اشهدوا. (مسلم، رقم 7250)

منجاب بن الحارث التمیمی نے بیان کیا، اور یہ لفظ اُنھی کے لیے ہے، ہمیں ابن مسہر نے خبر دی، اُن سے اعمش نے بیان کیا، اُن سے ابراہیم نے، اُن سے ابو معمر نے، اُن سے سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں تھے کہ چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا تو پہاڑ کے اِس طرف رہا اور ایک اُس طرف چلا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گواہ رہو۔“

حدثنا عبید اللّٰہ بن معاذ العنبری، حدثنا ابی، حدثنا شعبة، عن الاعمش، عن إبراهيم، عن ابی معمر، عن عبد اللّٰہ بن مسعود، قال: انشق القمر علی عهد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فلقتین، فستر الجبل فلقةً، وکانت فلقة فوق الجبل، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اللهم اشهد. (مسلم، رقم 7251)

”ہم سے عبید اللہ بن معاذ العنبری نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے ہمارے والد نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے شعبہ نے بیان کیا، اُن سے اعمش نے، اُن سے ابراہیم نے، اُن سے ابی معمر نے اور اُن سے سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ پس ایک ٹکڑے نے

پہاڑ کو ڈھانک لیا اور ایک ٹکڑا پہاڑ کے اوپر رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ، میں گواہی دیتا ہوں۔"

أخبرنا أبو عبد الله محمد بن عبد الله الحافظ، ثنا أبو العباس محمد بن يعقوب، ثنا العباس بن محمد، ثنا سعيد بن سليمان، ثنا هشيم، ثنا مغيرة، عن أبي الضحى، عن مسروق، عن عبد الله يعني ابن مسعود، قال: انشقّ القمر بمكة حتى صار فرقتين فقال كفار أهل مكة هذا سحر سحركم به ابن أبي كبشة.

"ہمیں ابو عبد اللہ محمد بن عبداللہ حافظ نے خبر دی کہ اُن سے ابو عباس محمد بن یعقوب نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے عباس بن محمد نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے سعید بن سلیمان نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے ہشیم نے بیان کیا، اُن سے مغیرہ نے، اُن سے ابو ضحیٰ نے، اُن سے مسروق نے، اُن سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مکہ میں چاند پھٹ گیا، یہاں تک کہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ کفار نے (ایک دوسرے سے) کہا کہ یہ جادو تھا، جو ابنِ ابی کبشہ [14]

[14] کفارِ قریش بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر "ابنِ ابی کبشہ" کے لقب سے کرتے تھے۔ اِس نسبت کی تحقیق میں مورخین و محدثین نے متعدد آرا پیش کی ہیں۔ ایک راے یہ ہے کہ یہ زمانۂ ماضی کی ایک شخصیت وجز بن غالب سے نسبت ہے، جس کی کنیت ابو کبشہ تھی اور وہ بتوں کی پرستش سے انکار کرتا تھا اور لوگوں کو بھی اُس سے منع کرتا تھا۔ بلاذری نے لکھا ہے:

نے تم لوگوں پر کر دیا تھا۔

انظروا السفار فإن كانوا رأوا ما رأيتم فقد صدق وإن كانوا لم يروا ما رأيتم فهو سحر سحركم به قال فسئل السفار قال: وقدموا من كل وجه، فقالوا رأينا.

(الاعتقاد للبیہقی 1 / 269)

باہر کے لوگوں کا انتظار کرو۔ اگر اُنھوں نے بھی وہی دیکھا، جو تم نے دیکھا ہے تو پھر تو وہ سچ ہو گا اور اگر اُنھوں نے وہ کچھ نہیں دیکھا، جو تم نے دیکھا ہے تو پھر یہ جادو ہو گا، جو اُس نے تم پر کیا۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ جب مختلف اطراف سے لوگ آئے تو اُن سے یہ سوال پوچھا گیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ ہم بھی یہ منظر دیکھ چکے ہیں۔"

2۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی روایت

طحاوی کی "شرح مشکل الآثار" میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت نقل ہوئی ہے۔ یہ مختصر روایت ہے۔ اِس میں بیان ہوا ہے کہ جب یہ واقعہ رونما ہوا تو وہ اور بعض دیگر صحابہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم راہ موجود تھے۔ روایت یہ ہے:

حدثنا علي بن عبد الرحمنِ بنِ محمد بنِ المغيرة المخزومي الكوفي،

"ہم سے علی بن عبد الرحمٰن بن محمد بن مغیرہ مخزومی کوفی نے بیان کیا،

"ایک رائے یہ ہے کہ وجز بن غالب خزاعی تھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نانا وہب بن عبد مناف زہری کی والدہ ہند بنت ابی قیلہ کے والد تھے۔ وہ مکہ میں رہنے لگے تھے اور اُس کے اکابر میں شمار ہونے لگے تھے۔ بعض آرا کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی والد کی کنیت ابو کبشہ تھی۔" (انساب الاشراف 1 / 91)

حدثنا لوين، حدثنا حديج بن معاوية الجعفي، عن أبي إسحاق، عن أبي حذيفة قال أبو جعفر — وهو سلمة بن صهيب الارحبي — عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه قال: انشق القمر، ونحن مع رسول الله عليه السلام. (رقم 696)

اُنھوں نے کہا کہ ہم سے لوین نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے حدیج بن معاویہ جعفی نے بیان کیا، اُن سے ابو اسحاق نے، اُن سے ابوحذیفہ نے بیان کیا کہ ابو جعفر — جو سلمہ بن صہیب الارجی ہیں — نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: (ہم نے دیکھا کہ) چاند شق ہو گیا اور اُس وقت ہم رسول اللہ علیہ السلام کے ساتھ تھے۔"

3۔ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی روایت

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ مطعم بن عدی کے صاحب زادے ہیں۔ مطعم بن عدی وہی شخصیت ہیں، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طائف سے واپسی پر پناہ دی تھی۔ حضرت جبیر رضی اللہ عنہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ شق قمر کے موقع پر وہ مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب موجود تھے۔ اُن سے منقول ترمذی اور "المعجم الکبیر للطبرانی" کی روایات کا خلاصہ یہ ہے:

* ترمذی میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔
* ایک ٹکڑا ایک پہاڑ پر اور دوسرا دوسرے پہاڑ پر آ گیا۔
* کفار میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔ بعض نے کہا کہ وہ ہم پر تو جادو کر سکتے ہیں، مگر سب لوگوں پر جادو تو نہیں کر سکتے۔

"المعجم الکبیر للطبرانی" میں ہے کہ اِس موقع پر حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے۔

روایات درجِ ذیل ہیں:

حدثنا عبد بن حمید، حدثنا محمد بن کثیر، حدثنا سلیمان بن کثیر، عن حصین، عن محمد بن جبیر بن مطعم، عن ابیه، قال: انشق القمر علی عهد النبی صلی اللّٰه علیه وسلم حتی صار فرقتین علی هذا الجبل وعلی هذا الجبل، فقالوا: سحرنا محمد، فقال بعضهم: لئن کان سحرنا ما یستطیع ان یسحر الناس کلهم. (ترمذی، رقم 3289)

"ہم سے عبد بن حمید نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے محمد بن کثیر نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے سلیمان بن کثیر نے بیان کیا، اُن سے حصین نے بیان کیا، اُن سے محمد بن جبیر اپنے والد (جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ) کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا، ایک ٹکڑا اِس پہاڑ پر اور ایک ٹکڑا اُس پہاڑ پر۔ لوگوں نے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم پر جادو کر دیا ہے، لیکن اُنھی میں سے بعض نے کہا: اگر اُنھوں نے ہم پر جادو کر دیا ہے تو (باہر کے) سبھی لوگوں کو جادو کے زیرِ اثر نہیں لا سکتے۔"

حدثنا العباس بن حمدان الحنفی، حدثنا علی بن المنذر الطریقی، حدثنا محمد بن فضیل، عن

"ہم سے عباس بن حمدان حنفی بیان کرتے ہیں، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے علی بن منذر طریقی بیان کرتے ہیں،

حصین، عن سالم بن أبي الجعد، عن محمد بنِ جبیر، عن أبیه، قال: انشق القمر، ونحن مع رسول الله صلی الله علیه وسلم.
(المعجم الکبیر للطبرانی، رقم 1540)

اُنھوں نے کہا کہ ہم سے محمد بن فضیل بیان کرتے ہیں، اُن سے حصین بیان کرتے ہیں، اُن سے سالم بن ابی جعد، اُن سے محمد بن جبیر اپنے والد (حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ) کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ چاند پھٹ گیا اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے۔"

شق قمر کا مشاہدہ نہ کرنے والے اصحاب کی روایات

شق قمر کی روایت کرنے والوں میں عینی شاہدین کے علاوہ وہ اصحاب بھی شامل ہیں، جنھوں نے اِس واقعے کا مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ اُن میں سے بعض مدینہ میں تھے، بعض کم سن تھے اور بعض ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اِن میں سے حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم نمایاں ہیں۔ اِن کی روایات درجِ ذیل ہیں:

1۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی روایت

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ مدنی صحابی ہیں۔ یہ ہجرت سے تقریباً 30 سال پہلے یثرب میں پیدا ہوئے۔ شق قمر کے موقع پر اِن کی عمر کم و بیش 25 سال تھی اور یہ یثرب (مدینہ) میں مقیم تھے۔ اِن سے منقول روایت کا خلاصہ یہ ہے:

* "مصنف عبد الرزاق" میں ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے جمعے کا خطبہ دیتے ہوئے پہلے سورۂ قمر کی آیات پڑھیں اور پھر اِس واقعے کا ذکر کیا۔

* اُنھوں نے بتایا کہ شق قمر کا واقعہ چونکہ ظاہر ہو چکا ہے، اِس لیے اب قیامت بہت قریب ہے۔

روایت یہ ہے:

عن ابن عيينة، عن عطاء بن السائب، عن أبي عبد الرحمن السلمي قال: سمعت حذيفة يوم الجمعة وهو على المنبر قرأ اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ، وَانْشَقَّ الْقَمَرُ، فقال: قد اقتربت الساعة وقد انشق القمر فاليوم المضمار وغدًا السباق.(رقم 5285)

"ابن عیینہ بیان کرتے ہیں، اُن سے عطا بن سائب بیان کرتے ہیں کہ ابوعبد الرحمٰن سلمی فرماتے ہیں کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن منبر پر خطبہ دے رہے تھے۔ اُنھوں نے سورۂ قمر کی ابتدائی آیات تلاوت کیں: اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۔ پھر فرمایا: قیامت قریب آگئی ہے اور چاند دو ٹکڑے ہو چکا ہے۔ چنانچہ آج کا دن تیاری کا دن ہے اور کل کا دن سبقت کر کے آگے بڑھنے کا دن ہو گا۔"

2۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے فرزند ہیں۔ ہجرت سے دس گیارہ سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ شق قمر کے موقع پر اِن کی عمر تقریباً پانچ چھ

سال تھی۔ اِن سے منقول ترمذی اور مستدرک کی روایتوں کا خلاصہ یہ ہے:

* ترمذی کی روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاند پھٹ گیا تھا۔
* آپ نے فرمایا تھا: تم لوگ گواہ رہنا۔
* حاکم کی ''مستدرک علی الصحیحین'' میں اِس پر یہ اضافہ ہے کہ چاند کا ایک ٹکڑا سامنے رہا اور دوسرا پہاڑ کے پیچھے چلا گیا۔

دونوں روایتیں درجِ ذیل ہیں:

حدثنا محمود بن غیلان، حدثنا ابو داؤد، عن شعبة، عن الاعمش، عن مجاهد، عن ابن عمر، قال: انفلق القمر علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اشهدوا.

(ترمذی، رقم 2182)

''ہم سے محمود بن غیلان نے بیان کیا، اُنھوں کے کہا کہ ہم سے ابوداؤد نے بیان کیا، اُن سے شعبہ نے بیان کیا، اُن سے اعمش نے اور اُن سے مجاہد نے بیان کیا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چاند دو ٹکڑے ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ گواہ رہو۔''

فحدثناه أبو العباس محمد بن یعقوب، ثنا إبراهیم بن مرزوق البصری بمصر، ثنا أبو داؤد الطیالسی، ثنا شعبة، عنِ الاعمشِ، عن مجاهد، عن عبد الله بن عمرو رضی الله عنه، فِی قوله عز وجل: اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ

''ہم سے ابوعباس محمد بن یعقوب نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے ابراہیم بن مرزوق بصری نے مصر میں بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے ابوداؤد طیالسی نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ مجھ سے شعبہ نے

وَانْشَقَّ الْقَمَرُ. قال: كان ذلك على عهد النبي صلى الله عليه وسلم، انشق القمر فلقتين فلقة من دون الجبل، وفلقة خلف الجبل. فقال النبي صلى الله عليه وسلم: اللهم اشهد.(المستدرک للحاکم، رقم3759)

بیان کیا، اُن سے اعمش نے بیان کیا، اُن سے مجاہد بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے سورۂ قمر کی ابتدائی آیت کی شرح کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چاند دو ٹکڑوں میں شق ہو گیا تھا۔ ایک ٹکڑا پہاڑ کے سامنے تھا اور دوسرا اُس کے پیچھے۔ اِس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پروردگار میں گواہی دیتا ہوں۔''

3۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے ہیں۔ اِن کی پیدائش ہجرت سے 3 سال قبل شعبِ ابی طالب میں ہوئی تھی۔ شق قمر کا واقعہ اِن کی پیدائش سے پہلے کا ہے۔ بخاری و مسلم میں درج اُن سے منقول روایت کے مطابق اُنھوں نے فقط اتنی بات بیان کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاند پھٹ گیا تھا۔

روایت کے مختلف طرق درجِ ذیل ہیں:

حدثنا يحيى بن بكير، قال: حدثني بكر، عن جعفر، عن عراك بن مالك،

''ہم سے یحییٰ بن بکیر نے بیان کیا، کہا کہ مجھ سے بکر نے بیان کیا، اُن

عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود، عن ابن عباس رضى الله عنهما، قال: انشق القمر فى زمان النبى صلى الله عليه وسلم.
(بخاری، رقم 4866)

سے جعفر نے، اُن سے عراک بن مالک نے، اُن سے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود نے بیان کیا کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاند پھٹ گیا تھا۔“

حدثنا موسى بن قريش التميمى، حدثنا إسحاق بن بكر بن مضر، حدثنى ابى، حدثنا جعفر بن ربيعة، عن عراك بن مالك، عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود، عن ابن عباس، قال: إن القمر انشق على زمان رسول الله صلى الله عليه وسلم. (مسلم، رقم 7257)

”ہم سے موسیٰ بن قریش بن التمیمی نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے اسحاق بن بکر بن مضر نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ مجھ سے میرے والد نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے جعفر بن ربیعہ نے بیان کیا، اُن سے عراک بن مالک نے بیان کیا، اُن سے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود نے بیان کیا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاند پھٹ گیا تھا۔“

4۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ مدنی صحابی ہیں۔ یہ ہجرت سے دس سال پہلے یثرب

(مدینہ) میں پیدا ہوئے۔ شق قمر کے موقع پر اِن کی عمر کم و بیش پانچ سال تھی اور یہ یثرب میں مقیم تھے۔ اِن سے منقول روایت میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔

روایت کے مختلف طرق درجِ ذیل ہیں:

حدثنا مسدد، حدثنا یحیی حدثنا شعبة، عن قتادة، عن انس، قال: انشق القمر فرقتین.
(بخاری، رقم 4868)

”ہم سے مسدد نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے یحییٰ نے بیان کیا، اُن سے شعبہ نے، اُن سے قتادہ نے اور اُن سے انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ چاند دو ٹکڑوں میں پھٹ گیا تھا۔“

وحدثنا محمد بن المثنی، حدثنا محمد بن جعفر، وابو داؤد. وحدثنا ابن بشار، حدثنا یحیی بن سعید، ومحمد بن جعفر، وابو داؤد کلهم، عن شعبة، عن قتادة، عن انس، قال: انشق القمر فرقتین، وفی حدیث ابی داؤد: انشق القمر علی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم.
(مسلم رقم، 7256)

”ہم سے محمد بن مثنی نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے محمد بن جعفر اور ابوداؤد نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے ابنِ بشار نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے یحییٰ بن سعید، محمد بن جعفر اور ابوداؤد نے بیان کیا، اُن سے شعبہ نے بیان کیا، اُن سے قتادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ چاند دو ٹکڑوں میں پھٹ گیا تھا۔ اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے زمانے میں چاند پھٹ گیا

تھا۔"

روایتوں کا تجزیہ اور تقابلی جائزہ

درجِ بالا تمام روایتیں قرآنِ مجید کے بیان کی فی الجملہ تائید اور تفصیل کرتی ہیں۔ اِن میں سے کوئی بھی کتاب اللہ کے اصل بیان اور مدعا سے متصادم یا متجاوز نہیں ہے۔ اِن کے متفق علیہ نکات کا خلاصہ یہ ہے:

* شق قمر کا واقعہ ایک حسی واقعہ تھا۔
* یہ واقعہ ہجرتِ مدینہ سے کم وبیش پانچ سال پہلے پیش آیا تھا۔
* اِس کے عینی شاہدین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابۂ کرام اور کفارِ قریش شامل تھے۔
* لوگوں نے بلا امتیازِ مذہب اِسے نسلاً بعد نسلٍ آگے بیان کیا، اِس لیے تاریخی اعتبار سے اِس کی حیثیت خبرِ متواتر کی ہے۔
* واقعہ رات کے ابتدائی مرحلے میں اُس وقت پیش آیا، جب لوگ ابھی جاگ رہے تھے۔
* رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب منیٰ میں موجود تھے۔
* چاند بدرِ کامل کی صورت میں تھا اور واضح نظر آ رہا تھا۔
* چاند پھٹا اور دو ٹکڑے ہو کر الگ ہو گیا۔
* پھر ایک ٹکڑا پہاڑ کے ایک طرف چلا گیا اور دوسرا دوسری طرف چلا گیا۔
* اِس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو، تم گواہ رہنا۔
* کفار نے اِس واقعے کا براہِ راست مشاہدہ کیا، مگر اُنھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا، اِس

لیے اُنھوں نے اِسے جادو سے تعبیر کیا۔

* اُنھی میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ سفر سے آنے والے لوگوں کا انتظار کرو، کیونکہ اُن پر جادو نہیں ہو سکتا۔

* جب لوگ آئے تو اُنھوں نے بھی اِس واقعے کی شہادت دی۔

* چنانچہ کفار کو اِس واقعے کی حقیقت تسلیم کرنا پڑی۔

* اِس کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے۔

شق قمر کی کم و بیش تمام روایتوں میں فی الجملہ یہی نکات مذکور ہیں۔ تاہم، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے بعض طرق میں اِن کے علاوہ چند مزید باتیں بھی نقل ہوئی ہیں، جو دیگر اصحاب کی روایتوں میں منقول نہیں ہیں۔ یہ طرق درجِ ذیل ہیں:

حدثني عبدالله بن عبد الوهاب، حدثنا بشر بن المفضل، حدثنا سعيد بن ابي عروبة، عن قتادة، عن انس بن مالك رضي الله عنه: ان اهل مكة سالوا رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يريهم آيةً، فاراهم القمر شقتين حتى راوا حراءً بينهما.

(بخاری، رقم 3868)

”مجھ سے عبد اللہ بن عبد الوہاب نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے بشر بن مفضل نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے سعید بن ابی عروبہ نے بیان کیا، اُن سے قتادہ نے بیان کیا کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ کفارِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نشانی کا مطالبہ کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھا دیے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے حرا پہاڑ کو اُن دونوں ٹکڑوں کے بیچ میں دیکھا۔“

حدثني زهير بن حرب، وعبد بن

”مجھ سے زہیر بن حرب اور عبد

حمید، قالا: حدثنا یونس بن محمد، حدثنا شیبان، حدثنا قتادۃ، عن انس ان اھل مکۃ سالوا رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یریھم آیۃً فاراھم انشقاق القمر مرتین.(مسلم،رقم7254)

بن حمید نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے یونس بن محمد نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے شیبان نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے قتادہ نے بیان کیا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مکہ والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نشانی چاہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دو بار چاند کا پھٹنا دکھایا۔"

اِن طرق میں درجِ ذیل تین اضافی باتیں نقل ہوئی ہیں:

1۔ شق قمر کا واقعہ دو مرتبہ پیش آیا۔

2۔ یہ کفار کے مطالبۂ نشانی کے جواب میں واقع ہوا۔

3۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں چاند کا دو ٹکڑے ہونا دکھادیا۔

یہ تینوں نکات امکانِ وقوع کے لحاظ سے بعید از قیاس نہیں ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی قدرت سے چاند ایک بار شق ہو سکتا ہے تو ایک سے زیادہ مرتبہ بھی ہو سکتا ہے۔ اِسی طرح اللہ اگر اقوام سابق کے مطالباتِ نشانی کے جواب میں کوئی نشانی بھیج سکتا ہے تو یہ معاملہ قریش کے ساتھ بھی ممکن ہے۔ مزید برآں، یہ کہ اگر اللہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو متعدد دیگر معجزے عطا فرما سکتا ہے تو شق قمر کو بھی آپ کے ذریعے سے ظاہر کرنا خلافِ توقع نہیں ہے۔ تاہم، اِس کے باوجود بیش تر محدثین اور مفسرین نے اِن اضافوں کو قبول نہیں کیا۔

اِس ضمن میں اُن کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

1۔ اِس واقعے کے وقوع کے موقع پر حضرت انس رضی اللہ عنہ چار پانچ سال کے کم سن

تھے اور مدینہ میں رہتے تھے۔ اِس سے واضح ہے کہ اُنھوں نے اِس واقعے کا براہِ راست مشاہدہ نہیں کیا۔ مزید یہ کہ جن شخصیات سے اُنھوں نے واقعے کو سنا، اُن کا ذکر روایت میں نہیں ہے۔ اِس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ اُنھوں نے اِسے اپنے زمانے کی ایک مشہور و معروف خبر کے طور پر سنا اور نقل کیا ہے۔ اِس بنا پر ضروری ہے کہ اِس معاملے میں اصل خبر کی حیثیت واقعے کے عینی شاہد حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کو دی جائے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایتوں کے فقط اُنھی اجزا کو قبول کیا جائے، جو ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر عینی شاہدین کی روایات سے مطابقت رکھتے ہیں۔

2۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں 'مرتین' کے الفاظ آئے ہیں۔ جن کا مطلب یہ ہے کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا ہے۔ یہ ایک بالکل منفرد بات ہے۔ قرآنِ مجید کے الفاظ بھی اِس مفہوم کی گنجایش نہیں دیتے۔ وہ انشقاق القمر کے واحد وقوع پر دلالت کرتے ہیں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ بعد کے بعض راویوں نے غلط فہمی سے 'فرقتین' یا 'فلقتین' (دو ٹکڑے) کو 'مرتین' (دو بار) سمجھ کر نقل کر دیا ہے۔ یہ غلطی مذکورہ روایت کے ضعف کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

3۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی بعض طرق میں کفار کی طرف سے نشانی کے مطالبے کا ذکر نہیں ہے اور بعض طرق میں 'مرتین' کے بجائے درست لفظ 'فرقتین' استعمال ہوا ہے۔ یہ بات بھی اِس امر کا امکان پیدا کرتی ہے کہ اِس طرح کے الفاظ بعد کے راویوں کے اضافے ہیں۔

ان دلائل کے حوالے سے حدیث و تفسیر کے چند علما کے اقتباسات درجِ ذیل ہیں:

''المواہب اللدنیہ'' میں علامہ احمد بن محمد قسطلانی لکھتے ہیں:

فأما أنس وابن عباس فلم يحضرا ذلك، لانه كان بمكة قبل الهجرة بنحو	''جہاں تک حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ

خمس سنين، وكان ابن عباس إذ ذاك لم يولد، وأما أنس فكان ابن أربع سنين أو خمس بالمدينة.
(254/2)

عنہ کا تعلق ہے تو وہ اِس واقعہ کے وقت موجود نہ تھے، کیونکہ یہ واقعہ مکہ مکرمہ میں ہجرت سے تقریباً پانچ سال پہلے ہوا اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ ابھی پیدا ابھی نہیں ہوئے تھے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ اُس وقت چار پانچ سال کے تھے اور مدینہ طیبہ میں تھے۔“

امام ابنِ حجر عسقلانی نے ”فتح الباری“ میں لکھا ہے:

لان أنسًا لم يدرك هذه القصة وقد جاءت هذه القصة من حديث بن عباس وهو أيضًا ممن لم يشاهدها ومن حديث بن مسعود وجبير بن مطعم وحذيفة وهؤلاء شاهدوها ولم ار في شيء من طرقه ان ذلك كان عقب سؤال المشركين الا في حديث أنس ثم وجدت في بعض طرق حديث بن عباس. (182/7)

”حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اِس واقعے کا مشاہدہ نہیں کیا، اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ جن سے یہ واقعہ منقول ہے، اُنھوں نے بھی اِس کا مشاہدہ نہیں کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت جبیر بن مطعم اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم جو اِس واقعے کے عینی شاہد ہیں، اُن کی روایتوں میں اِس طرح کی بات نہیں ہے کہ یہ واقعہ مشرکین کے مطالبے کے جواب میں تھا۔ یہ بات صرف حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں مذکور ہے یا حضرت ابنِ عباس

رضی اللہ عنہ کے بعض طرق میں نقل ہوئی ہے۔"

وہ مزید لکھتے ہیں:

ولااعرف من جزم من علماء الحدیث بتعدد الانشقاق فی زمنه صلی اللّٰه علیه و سلم، ... وهذامما یعلم أهل الحدیث والسیر انه غلط فإنه لم یقع الا مرةً واحدةً.

(183/7)

"میں نہیں جانتا کہ علمائے حدیث میں سے کوئی اِس کا قائل ہوا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاند کے شق ہونے کا واقعہ متعدد بار ہوا... اور اہل حدیث اور اہل سیر کے نزدیک یہ بات غلط ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ شق قمر کا واقعہ فقط ایک مرتبہ ہوا ہے۔"

حافظ ابنِ حجر کی اِسی بات کا خلاصہ کرتے ہوئے علامہ قسطلانی نے لکھا ہے:

ولعل قائل 'مرتین' أرادا: فرقتین. وهذا الذی لا یتجه غیره جمعًا بین الروایات.

(المواہب اللدنیہ 256/2)

"اور ممکن ہے کہ 'مرتین' کہنے والوں کا مطلب 'فرقتین' ہو۔ مختلف روایات کو صرف اِسی طرح جمع کیا جا سکتا ہے۔"

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اِن نکات کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ "تفہیم القرآن" میں ہے:

"بعض روایات جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، اُن کی بنا پر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شق القمر کا واقعہ ایک مرتبہ نہیں، بلکہ دو مرتبہ پیش آیا تھا۔ لیکن اول تو صحابہ میں سے کسی اور نے یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ دوسرے خود حضرت انس کی بھی بعض روایات میں مرتین (دو مرتبہ) کے الفاظ ہیں اور بعض میں 'فرقتین' اور 'شقتین'

(دو ٹکڑے) کے الفاظ۔ تیسرے یہ کہ قرآنِ مجید صرف ایک ہی انشقاق کا ذکر کرتا ہے۔ اِس بنا پر صحیح بات یہی ہے کہ یہ واقعہ صرف ایک مرتبہ پیش آیا تھا۔ رہے وہ قصے جو عوام میں مشہور ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلی سے چاند کی طرف اشارہ کیا اور وہ دو ٹکڑے ہو گیا اور یہ کہ چاند کا ایک ٹکڑا حضور کے گریبان میں داخل ہو کر آپ کی آستین سے نکل گیا، تو یہ بالکل ہی بے اصل ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس واقعہ کی حقیقی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ ایک معجزہ تھا، جو کفارِ مکہ کے مطالبہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت کے ثبوت میں دکھایا تھا؟ یا یہ ایک حادثہ تھا، جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے چاند میں پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اِس کی طرف توجہ صرف اِس غرض کے لیے دلائی کہ یہ امکانِ قیامت اور قربِ قیامت کی ایک نشانی ہے؟ علماے اسلام کا ایک بڑا گروہ اِسے حضور کے معجزات میں شمار کرتا ہے اور اُن کا خیال یہ ہے کہ کفار کے مطالبہ پر یہ معجزہ دکھایا گیا تھا۔ لیکن اِس راے کا مدار صرف بعض اُن روایات پر ہے، جو حضرت انس سے مروی ہیں۔ اُن کے سوا کسی صحابی نے بھی یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ فتح الباری میں ابنِ حجر کہتے ہیں کہ "یہ قصہ جتنے طریقوں سے منقول ہوا ہے، اُن میں سے کسی میں بھی حضرت انس کی حدیث کے سوا یہ مضمون میری نگاہ سے نہیں گزرا کہ شق القمر کا واقعہ مشرکین کے مطالبہ پر ہوا تھا۔" (باب انشقاق القمر)۔ ایک روایت ابو نعیم اصفہانی نے "دلائل النبوۃ" میں حضرت عبد اللہ بن عباس سے بھی اِس مضمون کی نقل کی ہے، مگر اُس کی سند ضعیف ہے، اور قوی سندوں سے جتنی روایات کتبِ حدیث میں ابنِ عباس سے منقول ہوئی ہیں، اُن میں سے کسی میں بھی اِس کا ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں حضرت انس اور حضرت عبد اللہ بن عباس، دونوں اِس واقعہ کے ہم عصر نہیں ہیں۔ بخلاف اِس کے جو صحابہ اُس زمانے میں موجود تھے، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت جبیر بن مطعم، حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن عمر، اُن میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ مشرکین مکہ نے حضور کی

صداقت کے ثبوت میں کسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا اور اِس پر شق القمر کا یہ معجزہ اُن کو دکھایا گیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید خود بھی اِس واقعہ کو رسالت محمدی کی نہیں، بلکہ قربِ قیامت کی نشانی کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ البتہ، یہ اِس لحاظ سے حضور کی صداقت کا ایک نمایاں ثبوت ضرور تھا کہ آپ نے قیامت کے آنے کی جو خبریں لوگوں کو دی تھیں، یہ واقعہ اُن کی تصدیق کر رہا تھا۔"(5/229-230)

باب چہارم

شق قمر کا واقعہ

مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کا موقف

گذشتہ ابواب میں استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کا موقف پوری تفصیل سے سامنے آ گیا ہے۔ یہ اپنے بنیادی استدلال اور مرکزی خیال کے لحاظ سے سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے نقطہ ہاے نظر پر مبنی ہے۔ اِس موضوع پر اپنی گفتگو میں اُنھوں نے اِس بات کو نہایت صراحت سے بیان کیا ہے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:

"میں شق قمر کے معاملے میں متفرد نہیں ہوں، میری کوئی الگ راے نہیں ہے۔ اِس میں محقق علما کا ایک نقطۂ نظر ہے، میں اُسے صحیح سمجھتا ہوں۔ مجھ سے پہلے دو جلیل القدر اہل علم نے یہ نقطۂ نظر اپنی تفسیروں میں بیان کر دیا ہے۔ میرے جلیل القدر استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کو اپنی تفسیر "تدبرِ قرآن" میں بیان کیا ہے اور اُن سے پہلے دورِ حاضر کے جلیل القدر داعی مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اِسے "تفہیم القرآن" میں بیان کیا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اِس باب کی تمام چیزوں کو موضوع بنایا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ پورے مواد کا تجزیہ کر کے یہ بتایا ہے کہ واقعے کی نوعیت کیا ہے؟ روایات میں کیا بات بیان ہوئی ہے؟ اِس کو دیکھنا کیسے چاہیے؟ اِس پر کیا اعتراضات ہوتے ہیں؟ اِس میں جو مختلف تعبیریں اختیار کی گئی ہیں، اُن میں کتنا وزن ہے؟ اِن تمام

چیزوں کا بہت عمدہ تجزیہ کر دیا ہے۔ میں اِن کے حرف حرف سے اِس معاملے میں اتفاق کرتا ہوں۔ اِس لیے یہ بات ہی درست نہیں ہے کہ میں اِس میں متفرد ہوں یا میری کوئی الگ راے ہے۔''(ویڈیو ریکارڈنگ 23 اعتراضات، شق القمر)

اِس تناظر میں یہ ضروری ہے کہ موضوع کے جملہ مباحث پر اِن جلیل القدر علما کی توضیحات کو بعینہٖ نقل کر دیا جائے۔ اِس سے وہ مندرجات سامنے آجائیں گے، جن کی تفصیل گذشتہ صفحات میں کی گئی ہے۔

مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کا مذکورہ موقف اُن کی تفاسیر ''تفہیم القرآن'' اور ''تدبرِ قرآن'' میں سورۂ قمر کی ابتدائی آیات کے تحت بیان کیا ہے۔ اِس کے مباحث درجِ ذیل ہیں۔

1۔ سورۂ قمر کا موضوع اور مخاطبین

دونوں مفسرین کے نزدیک سورہ کے مخاطبین کفارِ قریش ہیں۔ اُنھیں تنبیہ کی گئی ہے کہ قیامت کی گھڑی قریب آپہنچی ہے۔ اِس کی نشانی کے طور پر چاند شق کر کے دکھا دیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر وہ سمجھنا چاہیں تو اِس واضح نشانی کو دیکھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ اِس کے بعد اب اُن کے پاس بہت تھوڑا وقت بچا ہے۔ سابقہ اقوام کے انجام کا ذکر کر کے متنبہ کیا ہے کہ اگر تمھاری یہ روش جاری رہی تو تمھارا انجام بھی اُنھی جیسا ہو گا۔

مولانا مودودی بیان کرتے ہیں:

''اِس میں کفارِ مکہ کو اِس ہٹ دھرمی پر متنبہ کیا گیا ہے، جو اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلہ میں اختیار کر رکھی تھی۔ شق القمر کا حیرت انگیز واقعہ اِس بات کا صریح نشان تھا کہ وہ قیامت جس کے آنے کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے، فی الواقع برپا ہو سکتی ہے، اور اُس کی آمد کا وقت قریب آلگا ہے۔... کلام

کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ نہ سمجھانے سے مانتے ہیں، نہ تاریخ سے عبرت حاصل کرتے ہیں، نہ آنکھوں سے صریح نشانیاں دیکھ کر ایمان لاتے ہیں۔ اب یہ اُسی وقت مانیں گے، جب قیامت فی الواقع برپا ہو جائے گی اور قبروں سے نکل کر یہ داورِ محشر کی طرف دوڑے جا رہے ہوں گے۔

اِس کے بعد اُن کے سامنے قومِ نوح، عاد، ثمود، قومِ لوط، اور آلِ فرعون کا حال مختصر الفاظ میں بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی تنبیہات کو جھٹلا کر یہ قومیں کس دردناک عذاب سے دوچار ہوئیں، اور ایک ایک قوم کا قصہ بیان کرنے کے بعد بار بار یہ بات دہرائی گئی ہے کہ یہ قرآن نصیحت کا آسان ذریعہ ہے، جس سے اگر کوئی قوم سبق لے کر راہِ راست پر آ جائے تو اُن عذابوں کی نوبت نہیں آ سکتی، جو اِن قوموں پر نازل ہوئے۔ اب آخر یہ کیا حماقت ہے کہ اِس آسان ذریعہ سے نصیحت قبول کرنے کے بجائے کوئی اِسی پر اصرار کرے کہ عذاب دیکھے بغیر نہ مانے گا۔"

(تفہیم القرآن 5/ 226-227)

مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

"مخاطب اِس میں وہ مکذبین ہیں، جو قرآن کے انذار کی تصدیق کے لیے کسی ایسی نشانیِ عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے، جو اُنھیں قائل کر دے کہ فی الواقع قرآن کی یہ دھمکی سچی ہو کے رہے گی، اگر وہ اِس کو جھٹلاتے رہے۔ اُن کو پچھلی قوموں کی تاریخ، جس کی طرف پچھلی سورہ میں بھی اشارہ ہے، نسبتاً تفصیل کے ساتھ سنا کر متنبہ فرمایا ہے کہ آخر اِن قوموں کے انجام سے کیوں عبرت نہیں حاصل کرتے؟ کیوں مچلے ہوئے ہو کہ جب یہی کچھ تمھارے سروں پر بھی گزر جائے گا، تب مانو گے؟ یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اُس نے تمھیں عذاب کی نشانی دکھانے کی جگہ ایک ایسی کتاب تم پر اتاری ہے، جو تمھاری تعلیم و تذکیر اور تمھارے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے ہر پہلو سے جامع و کامل اور تمام ضروری اوصاف و محاسن سے آراستہ ہے۔ لیکن تمھارا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی

رحمت کی جگہ تم اُس کے عذاب کے طالب بنے ہوئے ہو۔“(تدبر قرآن 87/8)

2۔ ’انْشَقَّ‘ سے مراد ماضی یا مستقبل کا واقعہ

بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ’اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ‘ میں عہدِ رسالت کے کسی واقعے کا بیان نہیں ہے، بلکہ قیامت کے موقع پر ہونے والے حادثے کی پیشین گوئی ہے۔ اِس تصور پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ ’انشق‘ تو ماضی کا فعل ہے، اِس سے مستقبل کا واقعہ کیسے مراد لیا جا سکتا ہے؟ اِس کے جواب میں یہ استدلال کیا گیا ہے کہ مستقبل کے کسی واقعے کی قطعیت اور حتمیت کو نمایاں کرنے کے لیے ماضی کے صیغے کا استعمال عربی زبان و ادب کا مسلمہ قاعدہ ہے۔ مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی، دونوں اِس قاعدے کو تسلیم کرتے ہیں، مگر مذکورہ مقام پر اُنھوں نے اِس کے اطلاق کو غلط قرار دیا ہے۔ چنانچہ اُن کے نزدیک یہ زمانۂ رسالت ہی کا واقعہ ہے۔

”تدبرِ قرآن“ میں ہے:

”بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ قیامت کے دن پیش آنے والے واقعہ کی خبر ہے۔ جس کو ماضی کے صیغہ سے اِس کی قطعیت کے اظہار کے لیے بیان فرمایا گیا ہے۔ اُن کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ جائے گا۔ یہ قول اگرچہ اگلوں میں سے بھی بعض لوگوں سے نقل ہوا ہے اور اِس زمانے میں بھی اِس کو ایک گروہ کے اندر حسن قبول حاصل ہے، لیکن سیاقِ کلام اِس سے ابا کرتا ہے۔ اِس میں تو شبہ نہیں ہے کہ قیامت میں پیش آنے والے واقعات قرآن میں ماضی کے اسلوب میں بیان ہوئے ہیں، لیکن یہاں یہ معنی لیے جائیں تو کلام آگے والی بات سے بے جوڑ ہو جاتا ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ یہ کوئی سی نشانی بھی دیکھیں گے تو اُس سے اعراض ہی کریں گے اور کہیں گے کہ اِس میں کوئی خاص ندرت نہیں، یہ تو جادو ہے، جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ غور کیجیے کہ چاند

کے پھٹنے کا تعلق قیامت سے ہوتا تو اُس کے بعد یہ بات کہنے کا کیا محل تھا؟ قیامت کے دن تو کٹر سے کٹر منکر بھی کسی چیز کو جادو نہ کہہ سکے گا، بلکہ سب اعتراف کریں گے کہ رسولوں نے جو خبر دی، وہ حرف حرف سچی نکلی۔ چنانچہ آگے بیان بھی ہوا ہے کہ 'یَقُوْلُ الْکٰفِرُوْنَ هٰذَا یَوْمٌ عَسِرٌ' (اُس دن کافر کہیں گے کہ یہ تو بڑا ہی کٹھن دن آگیا)۔"(8/91-92)

"تفہیم القرآن" میں بیان ہوا ہے:

"بعض لوگوں نے اِس فقرے کا مطلب یہ لیا ہے کہ "چاند پھٹ جائے گا۔" لیکن عربی زبان کے لحاظ سے چاہے یہ مطلب لینا ممکن ہو، عبارت کا سیاق و سباق اِس معنی کو قبول کرنے سے صاف انکار کرتا ہے۔ اول تو یہ مطلب لینے سے پہلا فقرہ ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ چاند اگر اِس کلام کے نزول کے وقت پھٹا نہیں تھا، بلکہ وہ آیندہ کبھی پھٹنے والا ہے تو اِس کی بنا پر یہ کہنا بالکل مہمل بات ہے کہ قیامت کی گھڑی قریب آگئی ہے۔ آخر مستقبل میں پیش آنے والا کوئی واقعہ اُس کے قرب کی علامت کیسے قرار پا سکتا ہے کہ اُسے شہادت کے طور پر پیش کرنا ایک معقول طرزِ استدلال ہو۔ دوسرے، یہ مطلب لینے کے بعد جب ہم آگے کی عبارت پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اِس کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ آگے کی عبارت صاف بتا رہی ہے کہ لوگوں نے اُس وقت کوئی نشانی دیکھی تھی، جو امکانِ قیامت کی صریح علامت تھی، مگر اُنھوں نے اُسے جادو کا کرشمہ قرار دے کر جھٹلا دیا اور اپنے اِس خیال پر جمے رہے کہ قیامت کا آنا ممکن نہیں ہے۔ اِس سیاق و سباق میں اِنْشَقَّ الْقَمَرُ کے الفاظ اُسی صورت میں ٹھیک بیٹھ سکتے ہیں، جب کہ اُن کا مطلب "چاند پھٹ گیا" ہو۔ "پھٹ جائے گا" کے معنی میں اُن کو لے لیا جائے تو بعد کی ساری بات بے جوڑ ہو جاتی ہے۔ سلسلۂ کلام میں اِس فقرے کو رکھ کر دیکھ لیجیے، آپ کو خود محسوس ہو جائے گا کہ اِس کی وجہ سے ساری عبارت بے معنی ہو گئی ہے:

"قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ جائے گا۔ اُن لوگوں کا حال یہ ہے کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، منہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔ اُنھوں نے جھٹلا دیا اور

اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کی۔‘‘(5/228-229)

3۔ واقعے سے متعلق آیات اور روایات کا باہمی تعلق

شق قمر کا واقعہ قرآنِ مجید کے علاوہ احادیث و آثار میں بھی مذکور ہے۔ صاحبِ ’’تدبر‘‘ اور صاحبِ ’’تفہیم‘‘ یکساں طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ احادیث و آثار کو قرآنِ مجید کے متابعات کے طور پر قبول کرنا چاہیے۔ چنانچہ دونوں نے روایات کا ذکر اِس طرح کیا ہے کہ گویا قرآن کے متن کو اصل کی حیثیت حاصل ہے اور روایات میں اُسی کی بعض تفصیلات نقل ہوئی ہیں۔ مزید بر آں، لفظاً بھی اِس امر کی تصریح کر دی ہے۔

سید مودودی لکھتے ہیں:

’’حقیقت یہ ہے کہ شق القمر کا واقعہ قرآن کے صریح الفاظ سے ثابت ہے اور حدیث کی روایات پر اُس کا انحصار نہیں ہے۔ البتہ، روایات سے اِس کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں اور پتا چلتا ہے کہ یہ کب اور کیسے پیش آیا تھا۔‘‘(تفہیم القرآن 5/229)

مولانا اصلاحی نے بیان کیا ہے:

’’رہا یہ سوال کہ اِس طرح کا کوئی واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پیش آیا بھی ہے تو اِس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ سے، یہی بات نکلتی ہے کہ یہ پیش آیا اور حدیثوں سے بھی اِس کی تائید ہوتی ہے۔ صورتِ واقعہ کے بارے میں تو حدیثیں ضرور مختلف ہیں، لیکن نفس واقعہ کے بارے میں کوئی اختلاف منقول نہیں ہے۔‘‘(تدبر قرآن 8/91-92)

4۔ معجزۂ رسالت یا آیتِ الٰہی

تمہیدی باب میں ’’’آیۃ‘ کا مفہوم و مصداق‘‘ کے زیرِ عنوان یہ بات پوری طرح واضح ہو

گئی تھی کہ قرآنِ مجید میں یہ لفظ اللہ کی نشانیوں کے لیے آیا ہے۔ یہ جہاں اللہ کی طرف سے براہِ راست ظاہر ہونے والی نشانیوں کے مفہوم میں ہے، وہاں انبیاے کرام کے معجزات کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ دونوں میں اِس لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے کہ دونوں اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہیں اور اُسی کے حکم سے صادر ہوتی ہیں، مگر اظہار کے لحاظ سے یہ فرق ضرور ہے کہ اول الذکر میں اللہ تعالیٰ نبی کی وساطت کے بغیر براہِ راست معاملہ کرتے ہیں، جب کہ ثانی الذکر میں نبی کا توسط اختیار کیا جاتا ہے۔ ہماری مذہبی اصطلاح میں معجزے کا لفظ اُس نشانی کے لیے اختیار کیا گیا ہے، جو مخاطبین کے مطالبے پر نبی کے ہاتھ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اِس تناظر میں دیکھیے تو شق قمر کے لیے معجزہ یا معجزۂ نبوت کا لفظ استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔ اِسے آیتِ الٰہی سے تعبیر کرنا چاہیے۔ مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی، دونوں اِسی موقف کے قائل ہیں۔

مولانا مودودی نے اپنے موقف کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اِس ضمن میں اُنھوں نے اُن روایتوں پر بھی جرح کی ہے، جنھیں معجزے کے مفہوم پر محمول کرنے کے لیے بہ طورِ دلیل پیش کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس واقعہ کی حقیقی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ ایک معجزہ تھا، جو کفارِ مکہ کے مطالبہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت کے ثبوت میں دکھایا تھا؟ یا یہ ایک حادثہ تھا، جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے چاند میں پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اُس کی طرف توجہ صرف اِس غرض کے لیے دلائی کہ یہ امکانِ قیامت اور قربِ قیامت کی ایک نشانی ہے؟ علماے اسلام کا ایک بڑا گروہ اِسے حضور کے معجزات میں شمار کرتا ہے اور اُن کا خیال یہ ہے کہ کفار کے مطالبہ پر یہ معجزہ دکھایا گیا تھا۔ لیکن اِس راے کا مدار صرف بعض اُن روایات پر ہے، جو حضرت انس سے مروی ہیں۔ اِن کے سوا کسی صحابی نے بھی یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ ”فتح الباری“ میں ابنِ حجر کہتے ہیں کہ ”یہ قصہ جتنے طریقوں سے منقول ہوا ہے، اُن میں سے کسی میں بھی حضرت

انس کی حدیث کے سوا یہ مضمون میری نگاہ سے نہیں گزرا کہ شق القمر کا واقعہ مشرکین کے مطالبہ پر ہوا تھا۔" (باب انشقاق القمر)۔ ایک روایت ابو نعیم اصفہانی نے "دلائل النبوۃ" میں حضرت عبد اللہ بن عباس سے بھی اِس مضمون کی نقل کی ہے، مگر اُس کی سند ضعیف ہے، اور قوی سندوں سے جتنی روایات کتب حدیث میں ابنِ عباس سے منقول ہوئی ہیں، اُن میں سے کسی میں بھی اِس کا ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں حضرت انس اور حضرت عبد اللہ بن عباس، دونوں اِس واقعہ کے ہم عصر نہیں ہیں۔ بخلاف اِس کے جو صحابہ اِس زمانے میں موجود تھے، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت جبیر بن مطعم، حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن عمر، اُن میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ مشرکین مکہ نے حضور کی صداقت کے ثبوت میں کسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا اور اُس پر شق القمر کا یہ معجزہ اُن کو دکھایا گیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید خود بھی اِس واقعہ کو رسالتِ محمدی کی نہیں، بلکہ قربِ قیامت کی نشانی کے طور پر پیش کر رہا ہے۔"

(تفہیم القرآن 5/229-230)

مولانا اصلاحی کا بیان یہ ہے:

"اِس طرح کی نشانیوں کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ رسول نے اِن کو اپنے معجزے کے طور پر پیش کیا ہو، بلکہ اِن کا ظہور کسی اعلان و تحدی کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کفار نے بعینہٖ اِسی نشانی کا مطالبہ کیا ہو، جو ظاہر ہوئی، بلکہ اُن کی طرف سے کسی مطالبہ کے بغیر محض اِس لیے بھی اِن کا ظہور ہوتا ہے کہ کفار کے پیش کردہ شبہات کا اُن کو جواب مل جائے۔ کفارِ قیامت کو جو بہت بعید از عقل چیز خیال کرتے تھے، اُس کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ یہ ساری کائنات ایک دن بالکل درہم برہم ہو جائے۔ پہاڑوں سے متعلق اُن کا جو سوال قرآن میں نقل ہوا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن چیزوں کو وہ بالکل اٹل، غیر متزلزل اور غیر فانی سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شق قمر کی نشانی دکھا کر اُن کو بتایا کہ اِس کائنات کی چیزوں میں سے کوئی چیز

بھی، خواہ وہ کتنی ہی عظیم ہو، نہ خود مختار ہے، نہ غیر فانی، نہ غیر متزلزل، بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے۔ وہ جب چاہے گا، اِن سب کو درہم برہم کر کے رکھ دے گا۔"

(تدبر قرآن 8/ 91)

5۔ رسالتِ محمدی کی تائید و تصدیق

دونوں مفسرین شق قمر کو معجزات النبی کے زمرے میں شمار نہ کرنے کے باوجود اِس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کی صداقت کی تاکید اور آپ کے انذار اور دعوت کی تائید کرتا ہے۔

مولانا اصلاحی نے لکھا ہے:

"اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کا حوالہ ہم اِس کتاب میں جگہ جگہ دے چکے ہیں کہ یوں تو اِس زمین و آسمان کے چپہ چپہ پر اُس کی قدرت و حکمت کی نشانیاں موجود ہیں اور آئے دن نئی نئی نشانیاں بھی ظاہر ہوتی رہتی ہیں، لیکن رسولوں کی بعثت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ خاص طور پر ایسی نشانیاں ظاہر فرماتا ہے، جس سے رسول کے انذار اور اُس کے دعوائے رسالت کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ قرآن میں اِس سنتِ الٰہی کا ذکر جگہ جگہ ہوا ہے۔ ہم ایک آیت بہ طور مثال پیش کرتے ہیں۔ فرمایا ہے:

'سَنُرِيۡهِمۡ آيَاتِنَا فِيۡ الۡآفَاقِ وَفِيۡ اَنۡفُسِهِمۡ' (حٰم السجدہ 53) (ہم عنقریب اُن کو دکھائیں گے اپنی نشانیاں اِس کائنات میں بھی اور خود اُن کے اندر بھی)۔

اِن نشانیوں کا مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، رسول کے انذار کو تقویت پہنچانا ہوتا ہے۔ رسول جن باتوں کی منادی زبان سے کرتا ہے، اُس کی تائید کے آثار و شواہد اِس کائنات میں بھی، مختلف شکلوں میں، ظاہر ہوتے ہیں تاکہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت اچھی طرح پوری ہو جائے۔ اِسی طرح کی ایک نشانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار کی تائید کے لیے چاند کے پھٹنے کی صورت میں ظاہر ہوئی تاکہ منکرین عذاب و قیامت پر یہ

بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قرآن اُن کو جو ڈرا رہا ہے کہ زمین اُس دن ہلا دی جائے گی، پہاڑ پاش پاش ہو کر فضا میں اڑنے لگیں گے، سمندر ابل پڑیں گے، سورج تاریک ہو جائے گا؛ یہ باتیں اُن کو مرعوب کرنے کے لیے نہیں بیان ہوئی ہیں، بلکہ یہ حقائق ہیں، جو ایک دن پیش آ کے رہیں گے اور یہ بعید از امکان بھی نہیں ہیں، اِن کے شواہد کسی نہ کسی شکل میں اِس دنیا میں بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔" (تدبر قرآن 8/90-91)

مولانا مودودی بیان کرتے ہیں:

"یہ اِس لحاظ سے حضور کی صداقت کا ایک نمایاں ثبوت ضرور تھا کہ آپ نے قیامت کے آنے کی جو خبریں لوگوں کو دی تھیں، یہ واقعہ اُن کی تصدیق کر رہا تھا۔"

(تفہیم القرآن 5/230)

خلاصۂ مباحث

1۔ شق قمر کا واقعہ قرآنِ مجید میں سورۂ قمر (54) کی ابتدائی آیات میں بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہے: 'اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً'، "وہ گھڑی قریب آگئی، جس سے اِنھیں خبر دار کیا جا رہا ہے اور چاند شق ہو گیا۔ (مگر یہ نہ مانیں گے) اور خواہ کوئی آیت دیکھ لیں۔"

2۔ اِس سے واضح ہے کہ قرآنِ مجید نے اِس واقعے کو 'آیۃ' سے تعبیر کیا ہے۔

3۔ 'آیۃ' عربی زبان کا معروف لفظ ہے۔ اِس کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔

4۔ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کی نسبت سے بیان ہو تو اِس سے مراد انفس و آفاق کی وہ نشانیاں ہوتی ہیں، جو اُس کی مختلف صفات کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

5۔ قرآنِ مجید جب انسانوں کو اللہ کی صفات کے بارے میں توجہ دلانا چاہتا ہے تو وہ اِنھی آیات کو بہ طورِ دلیل پیش کرتا ہے اور اِس طرح اُن کے لیے تذکیر و ترغیب، تہدید و تخویف اور تنبیہ و تعذیب کا سامان کرتا ہے۔

6۔ اِس اصطلاحی مفہوم میں یہ لفظ قرآنِ مجید میں چار مختلف اطلاقات کے لیے استعمال ہوا ہے:

i۔ انفس و آفاق میں معمول کے مطابق ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی کے لیے — جو انفس و آفاق میں ظاہر و باہر ہیں اور جن کا تعلق اللہ کی قدرت کے عادی امور سے ہے۔ اللہ کا انسان کو مٹی کے خمیر سے تخلیق کرنا یا سورج اور چاند کو ایک قانون کا پابند کرنا یا آسمان سے پانی برسا

کر مردہ زمین کے اندر زندگی پیدا کرنا اِسی نوعیت کی آیات ہیں۔

ii۔ انفس و آفاق میں معمول کے خلاف ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی کے لیے —— جو مافوق الفطرت اور خارقِ عادت ہیں اور اللہ کے براہِ راست حکم سے یا کارکنانِ قضا و قدر کے ذریعے سے واقع ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانۂ رسالت میں بنی اسرائیل پر من و سلویٰ اترنا، صحرائے سینا میں اُن پر مستقل بادلوں کا سایہ رہنا، حضرت مسیح علیہ السلام کا بن باپ کے پیدا ہونا اور گہوارے میں کلام کرنا اِسی کی مثالیں ہیں۔

iii۔ انفس و آفاق کی خلاف معمول ظاہر ہونے والی اُن آیاتِ الٰہی کے لیے —— جو مافوق الفطرت اور خارقِ عادت ہیں اور اللہ کے حکم پر اُس کے نبیوں کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اِنھی کو مذہبی اصطلاح میں ''معجزہ'' کہا جاتا ہے۔ اِس کے نظائر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا سانپ بننا، اُس کی ضرب سے بارہ چشموں کا پھوٹنا، حضرت مسیح علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا اور رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر کلام الٰہی کا جاری ہونا شامل ہیں۔

iv۔ انفس و آفاق میں حسبِ معمول اور خلافِ معمول ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی کو بیان کرنے والی آیاتِ قرآنی کے لیے —— جو قرآن کے بین الدفتین درج ہیں اور اُس کی سورتوں کے فقروں کے طور پر تلاوت کی جاتی ہیں۔

7۔ اب سوال یہ ہے کہ سورۂ قمر میں لفظِ 'آیۃ' مذکورہ چار اطلاقات میں سے کس اطلاق کو قبول کرتا ہے؟ اِس کے جواب میں اگر ہم اِسے قرآن کے جملے یا آیت کے مفہوم میں لینا چاہیں تو اِس کی کوئی گنجایش نہیں ہے، کیونکہ یہاں یہ لفظ کسی فقرے کے لیے نہیں، بلکہ واقعے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اِسی طرح اگر اِس کا اطلاق انفس و آفاق کی معمول کے مطابق ظاہر ہونے والی نشانیوں پر کیا جائے تو یہ بھی درست نہ ہو گا، کیونکہ یہ معمول کا واقعہ نہیں ہے۔ معلوم انسانی تاریخ میں یہ واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا ہے۔ جہاں تک اُن آیات کا

تعلق ہے، جو معجزات و خوارق کی صورت میں انبیا کے توسط سے ظاہر ہوتی ہیں تو اُن کے زمرے میں بھی اِس واقعے کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا توسط اختیار نہیں کیا گیا۔ یعنی نہ آپ نے اپنی زبان سے کوئی الفاظ صادر فرمائے، نہ دستِ مبارک کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے ہونے کا حکم دیا اور نہ اُس کی جانب کسی چیز کو پھینکا۔ ایسی کوئی صورت ہوتی تو بلاشبہ، اِس واقعے کا شمار اُن آیات میں ہوتا، جو اللہ کے اذن پر انبیا کے ہاتھ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اب ایک ہی صورت باقی ہے کہ اِسے آیاتِ الٰہی کی اُس نوعیت پر محمول کیا جائے، جو خارقِ عادت تو ہے، مگر اللہ کی طرف سے براہِ راست ظاہر ہوئی ہے۔

8۔ چنانچہ درست تاویل یہی ہے کہ یہ واقعہ ایسی غیر معمولی نشانی ہے، جو اللہ کے براہِ راست حکم سے ظاہر ہوئی اور اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط کو اختیار نہیں کیا گیا۔ یعنی اِس کا شمار اُسی طرح کی نشانیوں میں ہوتا ہے، جیسی اِس سے پہلے بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے زمانے میں ظاہر کی گئیں۔ اِن کی مثالیں من و سلویٰ کا اترنا، بدلیوں کا سایہ فگن ہونا، کوہِ طور کا معلق ہونا، سیدنا مسیح کا بن باپ کے تخلیق پانا ہیں۔

9۔ قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخری رسالت کے زمانے میں بھی اِسی طرح کی نشانیاں دکھانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ سورۂ حٰم السجدہ (41) کی آیت 53 میں اِن الفاظ میں بیان ہوا ہے: ”(تم مطمئن رہو، اے پیغمبر، اور یہ بھی متنبہ ہو جائیں)، اِنھیں ہم عنقریب اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود اِن کے اندر بھی، یہاں تک کہ اِن پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن بالکل حق ہے۔“

10۔ قرآن سے یہ بھی واضح ہے کہ شق قمر کی نشانی کفارِ قریش کے لیے تھی اور اِس کا مقصد اُنھیں 'الساعۃ'، یعنی قیامت کی گھڑی کے بارے میں متنبہ کرنا تھا۔ رسول کے مکذبین کے لیے قیامت کی یہ گھڑی اُس عذاب سے شروع ہو جاتی ہے، جو اُس کی تکذیب پر اصرار

کے نتیجے میں دنیا ہی میں برپا ہو جاتا ہے اور اِس گھڑی کا اتمام اُس وقت ہو گا، جب صور پھونکا جائے گا اور قیامت واقع ہو جائے گی۔

11۔ شق قمر کا واقعہ اصلاً قرآنِ مجید میں مذکور ہے۔ اُس نے اِس قسم کی نشانیوں کے پس منظر اور خاص اِس واقعے کی نوعیت اور غرض و غایت کو پوری صراحت سے واضح کیا ہے۔ چنانچہ اِس واقعے کی تشریح و تفصیل میں اُسی کے مندرجات کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔

12۔ تاہم، اِس کا ذکر متعدد صحابۂ کرام نے بھی کیا ہے۔ اِن میں حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت جبیر بن مطعم، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت انس بن مالک رضوان اللہ علیہم اجمعین نمایاں ہیں۔ اِن میں سے بعض عینی شاہدین ہیں اور بعض نے اِسے دوسروں کی شہادت پر روایت کیا ہے۔

13۔ روایتوں کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ یہ واقعہ زمانۂ رسالت میں ہجرت سے کم و بیش 5 سال پہلے رونما ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب منیٰ میں موجود تھے۔ چاند بدرِ کامل کی صورت میں تھا اور واضح نظر آ رہا تھا۔ یک بہ یک وہ پھٹا اور دو ٹکڑے ہو کر الگ ہو گیا۔ ایک ٹکڑا پہاڑ کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف چلا گیا۔ یہ حیرت انگیز منظر لحظہ بھر کے لیے قائم رہا اور پھر دونوں ٹکڑے آپس میں مل گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم اِس واقعے کے گواہ رہنا۔ کفار نے یہ منظر براہِ راست دیکھا، مگر اُنھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اِس لیے اُنھوں نے اِسے جادو کہہ کر جھٹلانے کی کوشش کی۔ اُن میں سے بعض نے تجویز دی کہ حتمی راے قائم کرنے سے پہلے سفر پر گئے ہوئے لوگوں کو واپس آ لینے دیں۔ اُن کا مشاہدہ فیصلہ کن ہو گا، کیونکہ ہماری آنکھیں تو مسحور ہو سکتی ہیں، مگر غیر موجود ہونے کی وجہ سے وہ سحر زدہ نہیں ہو سکتے۔ یہ تجویز قبول ہوئی۔ جب لوگ آئے تو معلوم ہوا کہ اُنھوں نے بھی بعینہٖ چاند کے پھٹنے کا مشاہدہ کیا تھا۔ چنانچہ کفار کے لیے واقعے کا انکار ممکن نہیں رہا۔ تاہم، اِس کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار کی تردید و تکذیب پر کمر بستہ رہے۔

14۔ اِس مجموعی مفہوم کی صحت پر علما و محدثین متفق ہیں۔

15۔ اِس متفق علیہ مفہوم پر حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منسوب بعض طرق میں یہ اضافہ شامل ہے کہ یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حینِ حیات دو مرتبہ واقع ہوا تھا اور قریش کے مطالبۂ نشانی کے جواب میں رونما ہوا تھا۔ محدثین و مفسرین میں سے بعض نے اِس اضافے کو قبول کیا ہے اور بعض نے راویوں کا تسامح سمجھ کر رد کیا ہے۔ قرآنِ مجید کے نظائر، سورۂ قمر کی آیات اور انشقاقِ قمر کے موضوع کی تمام روایتوں کو جمع کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ اضافہ صحیح نہیں ہے۔

16۔ شق قمر کی معجزانہ نوعیت کے بارے میں بھی علما میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حدیث و تفسیر کے اکثر علما اسے معجزاتِ نبوت میں شامل کرتے اور اِس کے صدور کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرتے ہیں۔ عصرِ حاضر کے دو جلیل القدر علما مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی اِسے اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیتے ہیں، مگر معجزے کی معروف اصطلاح کا اطلاق اِس پر نہیں کرتے۔ اُن کے نزدیک اِسے معجزاتِ نبوت میں شمار کرنا علمی اور اصطلاحی لحاظ سے درست نہیں ہے، کیونکہ یہ ایسا خارقِ عادت واقعہ ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا توسط اختیار نہیں کیا گیا۔ چنانچہ اِس کے لیے معجزہ یا معجزۂ نبوت کا لفظ استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔ اِسے آیتِ الٰہی سے تعبیر کرنا چاہیے۔

17۔ جناب جاوید احمد غامدی شق القمر کی بحث کے تمام اجزا میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی مجموعی راے سے اتفاق کرتے اور اِسی کو اپنے موقف کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

18۔ شق قمر کے بارے میں غامدی صاحب کے موقف کو اِن نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:

i۔ غامدی صاحب شق قمر کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔

ii۔ وہ اِسے ایک حسی واقعہ مانتے اور پروردگارِ عالم کی قدرتِ کاملہ کا مظہر قرار دیتے ہیں۔

iii۔ اُن کے نزدیک شق قمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ کے انذار کی تائید میں اور آپ کے مکذبین کے لیے عذاب کی نشانی کے طور پر واقع ہوا تھا۔

iv۔ وہ اپنے موقف کی بنا قرآنِ مجید پر قائم کرتے ہیں، مگر اُس کی تائید و تفہیم میں صحابہ کی روایات کو پوری طرح قبول کرتے ہیں۔

v۔ جہاں تک اِس کے لیے معجزے کی اصطلاح کے استعمال کا تعلق ہے تو وہ اُسے صحیح نہیں سمجھتے۔ اِس معاملے میں وہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے موقف کو قرآن و حدیث کے مطابق سمجھتے ہیں اور علما کے روایتی موقف کو قرآن و حدیث کے منشا کے موافق خیال نہیں کرتے۔

vi۔ اُن کے نزدیک اِس معاملے میں کلیدی حیثیت لفظِ 'آیة' کے مفہوم و مصداق کو حاصل ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ واقعے کے لیے قرآن نے یہی لفظ اختیار کیا ہے۔

vii۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اِس لفظ کا مصداق قرآنِ مجید کے نظائر کی روشنی میں طے کیا جائے تو اِس کا شمار اُن نشانیوں میں ہو گا، جو اللہ کے براہِ راست حکم سے ظاہر ہوئیں اور جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط کو اختیار نہیں کیا گیا۔

viii۔ تاہم، وہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن تمام معجزات و خوارق کو برحق مانتے ہیں، جو قرآنِ مجید میں بیان ہوئے ہیں یا حدیث و سیرت کی مستند روایات میں منقول ہیں۔

ضمیمہ جات

ضمیمہ 1

’’معجزہ‘‘ کا مفہوم اور شق قمر کے واقعہ پر اُس کا اطلاق

’معجزۃ‘ ’اعجاز‘ سے اسم فاعل ہے۔ اِس کے معنی ’’عاجز کر دینے والے‘‘ کے ہیں۔ عام مفہوم میں یہ کسی عظیم الشان اور غیر معمولی واقعے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اصطلاح میں اِس سے مراد وہ خلافِ عادت امر ہے، جو انسانی دسترس سے باہر ہو اور اللہ کے حکم پر اُس کے نبیوں سے صادر ہو۔ ہماری علمی روایت کے مطابق یہ جن مفاہیم اور اطلاقات کو شامل ہے، وہ درجِ ذیل ہیں:

* معجزہ خارقِ عادت ہوتا ہے۔
* اللہ کے اذن پر مبنی ہوتا ہے۔
* نبی کی ذات سے ظاہر ہوتا ہے۔
* دعواے نبوت کی تائید و تصدیق کرتا ہے۔
* کبھی منکرین کے مطالبے پر نازل کیا جاتا ہے۔
* کبھی کفار کو تحدی (چیلنج) کرنا مقصود ہوتا ہے۔
* کبھی ثباتِ ایمان کے لیے صادر ہوتا ہے۔
* کبھی اہل ایمان کو اللہ کی نصرت سے فیض یاب کرتا ہے۔
* مخاطبین اِس کی مثل پیش کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔
* نتیجتاً یہ نبی کے مخاطبین پر اتمام حجت کا باعث بنتا ہے۔

چند جلیل القدر اہل علم کے اقتباسات نقل ہیں:

علامہ سعد الدین تفتازانی (793ھ) "شرح عقائد النسفی" میں لکھتے ہیں:

المعجزة هی امر یظهر بخلاف العادة علی یدی مدعی النبوة عند تحدی المنکرین علی وجه یعجز المنکرین عن الاتیان بمثله.(125)	"معجزہ خلافِ عادت امر ہے۔ یہ نبوت کے مدعی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ منکرین (نبوت) کو اِس (خلافِ عادت امر) کی مثل پیش کرنے کی دعوت دی جائے اور وہ ایسا کرنے سے عاجز ہوں۔"

علی بن محمد الشریف الجرجانی (816ھ) نے اپنی معروف کتاب "معجم التعریفات" میں معجزہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

المعجزة امر خارق للعادة داعیة الی الخیر والسعادة مقرونة بدعوی النبوة قصد به اظهار صدق من ادعی انه رسول من الله.(184)	"معجزہ وہ خلافِ معمول امر ہے جو خیر و برکت کی دعوت اور نبوت کے دعوے کو شامل ہو اور اِس کا مقصد اللہ کے رسول ہونے کا دعویٰ کرنے والے کی صداقت کا اظہار ہوتا ہے۔"

امام جلال الدین السیوطی (849ھ) نے لکھا ہے:

المعجزة: امر خارق للعادة، مقرون بالتحدی، سالم عن المعارضه. (الاتقان فی علوم القرآن 311/2)	"معجزہ ایسے خارقِ عادت امر کو کہتے ہیں، جس کے ساتھ تحدی (چیلنج) بھی شامل ہو اور اُس کا مقابلہ نہ کیا جا سکے۔"

محمد علی تھانوی (1158ھ) کی تالیف "کشاف اصطلاحات الفنون" میں ہے:

المعجزة: هي في الشرع امر خارق للعادة يظهر علىٰ يد مدعي النبوة موافقًا لدعواه. (1575)

”معجزہ: شریعت میں اِس سے مراد وہ خلافِ معمول امر ہے، جو نبوت کے مدعی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا اور اُس کے دعوے کی تائید کرتا ہے۔“

امام شاہ ولی اللہ (1174ھ) نے انبیا کے معجزات کی نوعیت اور ضرورت کو طبیب اور دوا کی مثال سے واضح کیا ہے۔ ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں لکھتے ہیں:

مثله في ذلك كمثل سيد مرض عبيده، فأمر بعض خواصه: أن يكلفهم شرب دواء أشاؤا ام أبوا، فلوأنه أكرههم على ذلك كان حقًا، ولكن تمام اللطف يقتضي ان يعلمهم اولاً انهم مرضى، وان الدواء نافع، وان يعمل اموراً خارقةً تطمئن نفوسهم بها على انه صادق فيما قال، وان يشوب الدواء بحلو فحينئذ يفعلون ما يؤمرون به على بصيرة منه، وبرغبة فيه؛ فليست المعجزات ولا استجابة الدعوات ونحو ذلك الا امورًا خارجةً عن اصل النبوة، لازمةً لها في الاكثر. (64/2)

”(نبوت کے) اِس معاملے میں اللہ تعالیٰ کی مثال اُس آقا جیسی ہے، جس کے غلام بیمار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اُس نے اپنے خاص کارکنان میں سے کسی کارکن کو حکم دیا ہے کہ وہ اُنھیں دوا پینے کا مکلف بنائے، اِس کے باوجود کہ وہ پینا چاہیں یا اُس کا انکار کریں۔ لہٰذا اگر وہ اِس معاملے میں اُن پر سختی کرے تو وہ حق بجانب ہو گا۔ تاہم، کامل مہربانی کا تقاضا ہے کہ (سختی سے) پہلے وہ اُنھیں سمجھائے کہ وہ بیمار ہیں اور یہ دوا اُن کے لیے مفید ہے۔ مزید یہ کہ وہ کچھ خارقِ عادت امور کو ظاہر کرے، جو اُنھیں اِس پر مطمئن کر دیں کہ وہ اپنے قول میں سچا ہے۔ یعنی دوا میں شیرینی ملا دے۔ اِس کے نتیجے میں غلام پوری

بصیرت اور رغبت کے ساتھ وہ کام
کریں گے، جن کا اُنھیں حکم دیا گیا
ہے۔ چنانچہ واضح ہوا کہ معجزات کا
ظہور، دعاؤں کی قبولیت اور اِس طرح
کے دیگر امور نبوت کی حقیقت سے
خارج ہیں، البتہ اکثر حالات میں نبوت
کے اسباب و لوازم میں شامل ہوتے
ہیں۔“

شاہ عبدالحق محدث دہلوی بیان کرتے ہیں:

”معجزہ خرقِ عادت کو کہتے ہیں، جو مدعی رسالت و نبوت کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس سے مقصود تحدی ہے۔ تحدی کے معنی کسی کام میں برابری کرنا اور دشمن کو عاجز کر کے غلبہ حاصل کرنا ہے۔ تحقیق یہی ہے کہ معجزہ میں تحدی شرط نہیں ہے۔“

(مدارج النبوہ 1 / 229)

مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

”جو نبی دعویٰ کرتا ہے کہ میں نبی ہوں... میری متابعت کے بغیر کوئی راستہ نجات کا نہیں ہے۔ اور اُس کی دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ اللہ جل شانہ میرے ہاتھوں اور زبان سے وہ چیزیں ظاہر فرمائے گا، جو اُس کی عام عادت کے خلاف ہوں گی اور دنیا اِس کی مثال لانے سے عاجز ہو گی۔ پھر اِس کے موافق مشاہدہ بھی کیا جا رہا ہو تو یہ خدا کی جانب سے عملاً اُس کے دعویٰ کی تصدیق ہے۔ درحقیقت معجزہ نبی کے دعویٰ کی عملی تصدیق ہوتی ہے۔“

(اعجاز القرآن 31)

معجزہ کے معنی و مفہوم کی اِس تفصیل کے بعد اب یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ قرآنِ مجید کی اصطلاح نہیں ہے۔ یہ عربی زبان ہی کا لفظ ہے اور اِس کے بعض اسالیب کلام الٰہی میں مذکور

بھی ہیں۔ لیکن جہاں تک درجِ بالا اصطلاحی مفہوم کا تعلق ہے تو اِس مفہوم میں یہ یا اِس کا کوئی اشتقاق کتاب الٰہی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔

یہی معاملہ کتب احادیث کا بھی ہے۔ اِن میں بھی یہ لفظ اختیار نہیں کیا گیا۔ تاہم، محدثین نے ابواب کے عنوانات کے لیے اِس لفظ کو اختیار کیا ہے۔

اِسی بنا پر بعض اہل علم کا موقف ہے کہ انبیا کے خوارق کے لیے معجزہ کے لفظ کو استعمال کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ سید سلیمان ندوی ''سیرت النبی'' میں ''اِن واقعات کا اصطلاحی نام'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

> ''حضرات انبیاے کرام علیہم السلام سے یہ جو مافوق العادت کیفیات اور اعمال صادر ہوتے ہیں، اِن کے لیے عام طور پر معجزہ کا لفظ بولا جاتا ہے، لیکن یہ اصطلاح کئی حیثیتوں سے غلط ہے، اول تو اِس لیے کہ قرآنِ مجید اور احادیث میں یہ لفظ مستعمل نہیں ہوا ہے، بلکہ اِس کی جگہ آیت (نشانی) اور برہان (دلیل) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جو اپنے مفہوم کو نہایت خوبی سے ظاہر کرتے ہیں۔ قدیم محدثین نے اِن کی جگہ دلائل اور علامات کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جو الفاظ قرآنی کے ہم معنی ہیں۔ دوسرے یہ کہ عام استعمال کی بنا پر ''معجزہ'' کے ساتھ کچھ خاص لوازم ذہنی پیدا ہو گئے ہیں، جو حقیقت میں صحیح نہیں ہیں، مثلاً: اِس لفظ سے عوام میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ وہ خود پیغمبر کا فعل ہوتا ہے، جس کا صدور خاص اُس کے اعضا و جوارح سے ہوتا ہے اور نیز یہ کہ اِس لفظ کے سبب سے اِس کا معجزہ ہونا گویا اِس کی حقیقت میں داخل ہو گیا ہے، حالانکہ یہ دونوں خیالات غلط ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ معجزہ پر عقلی حیثیت سے جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں، اُن کا ایک بڑا حصہ خود لفظِ معجزہ کے غلط استعمال سے پیدا ہو گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم کو ایک ایسا جامع لفظ درکار ہے، جس میں نبوت کے تمام خواص، کیفیات، مشاہدات اور اعمالِ خارقۂ عادت و غیر خارقۂ عادت، سب داخل ہیں، لیکن معجزہ کا لفظ اتنا وسیع نہیں... لیکن چونکہ ہماری زبان میں معجزہ کا لفظ عام طور پر چل گیا ہے، اِس لیے اِس کو یک قلم ترک بھی نہیں

کیا جا سکتا۔“(3/21-22)

اِس مفہوم کے لیے کتاب اللہ میں ’آیۃ‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی نشانی کے ہیں۔ تاہم، وہاں اِس سے مراد صرف انبیا کے ہاتھوں پر ظاہر ہونے والی نشانیاں ہی نہیں ہیں، اِس کے ساتھ وہ نشانیاں بھی اِس کے مصداقات میں داخل ہیں، جو انفس و آفاق میں روزمرہ ظاہر ہوتی ہیں اور وہ خلافِ معمول نشانیاں بھی داخل ہیں، جنھیں اللہ براہِ راست ظاہر کرتے ہیں۔ مزید برآں، قرآنِ مجید کے فقروں کے لیے بھی یہی لفظ آیت استعمال ہوتا ہے۔[15]

اب سوال یہ ہے کہ کیا شق قمر کے واقعے پر لفظ معجزہ کا اطلاق درست ہے؟ درجِ بالا تعریفات کی روشنی میں اِس کا جواب نفی میں ہو گا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِن کے مطابق معجزہ وہ خارقِ عادت واقعہ ہے، جو اللہ کے حکم سے نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ شق قمر، بلا شبہ خارقِ عادت واقعہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے ظاہر ہوا ہے، مگر قرآن و حدیث سے واضح ہے کہ اِس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا توسط اختیار نہیں کیا گیا۔ اللہ چاہتا تو اِس کے لیے اپنے پیغمبر کا توسط اختیار کر لیتا، جیسا کہ قرآن و حدیث میں مذکور متعدد دیگر معجزات میں اختیار کیا گیا ہے۔ اگر اللہ نے اپنی حکمت کے تحت ایسا نہیں کیا تو ہمیں اِسے معجزے کے بجاے آیتِ الٰہی سے تعبیر کرنا چاہیے۔ جیسے مثال کے طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا تو بلا شبہ، اُن کا معجزہ کہلائے گا، مگر اُن کے بن باپ کے پیدا ہونے کو اُن کا معجزہ نہیں کہا جائے گا، بلکہ اللہ کی آیت قرار دیا جائے گا۔

---

[15] مزید تفصیل اِسی تصنیف کے باب اول میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

ضمیمہ 2

شق قمر کے واقعے پر مورخین کی خاموشی

ایک اعتراض کا جواب

شق قمر کی حقانیت پر بعض لوگوں کی طرف سے اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ تاریخ کی روشنی کے زمانے میں دنیا میں اتنا بڑا واقعہ ہو جائے اور کسی کو اِس کی خبر نہ ہو؟ چنانچہ اُن کے نزدیک یہ واقعہ اگر ہوا تھا تو یہ ضروری تھا کہ دنیا کے مختلف علاقوں کے لوگ اِسے دیکھتے اور ہر خطے میں اِس کی روایتیں بیان ہوتیں۔ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی کتابوں کے سوا اِس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک یہ اعتراض کئی پہلوؤں سے بے بنیاد ہے۔

اولاً، قرآن اور حدیث، دونوں سے واضح ہے کہ یہ نشانی فقط قریش کے لیے تھی۔ باقی دنیا سے اِس کا اصلاً کوئی تعلق نہیں تھا۔ اِس کے ظہور کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین کو آنے والے عذاب سے پوری طرح متنبہ کر دیا جائے۔ گویا یہ اُسی طرح کی نشانی تھی، جیسی ناقہ کی شکل میں حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے سامنے ظاہر ہوئی یا سیدنا مسیح علیہ السلام کی پیدایش کی صورت میں بنی اسرائیل کے سامنے آئی تھی۔ اِن نشانیوں کا تعلق اُنھی اقوام سے تھا، جن میں یہ ظاہر ہوئی تھیں۔ اِس طرح کی نشانیوں کو تمام دنیا اور تمام اقوام

کے حوالے سے دیکھنا درست نہیں ہے۔

ثانیاً، یہ خبر قرآن میں مذکور ہے۔ اِس کتاب کے مندرجات کی بنا پر علم و عقل مجبور ہیں کہ اِسے الہامی اور غیر انسانی کلام کے طور پر قبول کریں۔ چنانچہ اگر مسلم ہے کہ یہ کتاب اپنے بیان میں ایک خارقِ عادت معجزہ ہے تو عقل و فطرت کا تقاضا ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں اِس کی تمام اطلاعات کو صحیح مانا جائے۔

ثالثاً، مذکورہ اعتراض پر جواباً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ واقعہ غلط ہے تو جس خطے میں اور جن لوگوں میں یہ واقعہ بلا انقطاع بیان ہو رہا ہے، اُن میں سے کسی نے اِس کی تردید کیوں نہیں کی؟ یہ کوئی ایسی خبر نہیں تھی، جو بند کمروں میں چند لوگوں کے سامنے بیان ہو رہی تھی اور سینہ بہ سینہ آگے منتقل ہو رہی تھی۔ ہرگز نہیں، یہ تو اعلانِ عام تھا، جو قرآن کے ذریعے سے گلیوں کوچوں میں دن رات نشر ہو رہا تھا۔ سننے والوں میں نصاریٰ بھی تھے، یہود بھی تھے، مشرکین بھی تھے۔ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اُن کا کوئی مصنف، کوئی شاعر، کوئی مورخ اِس زبان زدِ عام خبر کی تردید کر دیتا، جو بعد ازاں تاریخی دستاویز کے طور پر اگلی نسلوں کو منتقل ہوتی۔

رابعاً، مسلمانوں کے حوالے سے بھی دیکھیے تو یہ کوئی ایسی خبر نہ تھی کہ جس کا تعلق عقیدہ و ایمان یا زندگی بعد الموت سے ہو اور جسے اُس زمانے کے اہل ایمان کو فقط اِس بنا پر قبول کرنا پڑتا ہو کہ یہ قرآن میں مذکور ہے۔ اِس کے بجائے یہ ایک حسی واقعہ تھا۔ تو کیا ابتدائی صدی کے مسلمانوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا پیدا نہیں ہوا، جو اِس کے وقوع کی تردید کرے اور قرآن کے الفاظ کی کوئی مختلف تاویل کرنے کی کوشش کرے؟ اگر ایسا نہیں ہوا تو اِس کا مطلب ہے کہ یہ قرآن کی مصدقہ خبر تھی، جسے صحابہ اور تابعین نے اپنے اجماع و تواتر سے آگے منتقل کیا۔ اِس لیے اِس خبرِ متواتر کا انکار ایک بدیہی امر کا انکار ہے۔

خامساً، مزید یہ کہ یہ خبر بخاری و مسلم جیسے مستند ترین تاریخی ماخذوں میں نقل ہوئی اور اِس کے بیان کرنے والوں میں وہ لوگ ہیں، جن کی ثقاہت ہر شک و شبہے سے پاک ہے۔ اُن

میں سے بعض اِس کے عینی شاہدین بھی ہیں۔ اِس لیے یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ تاریخ اِس کے بارے میں خاموش ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس تاریخ کو اِس کے بارے میں بولنا چاہیے، وہ ببانگِ دہل اِس کا اعلان کر رہی ہے۔ مذکورہ اعتراض کے جواب میں ہمارے اہل علم نے بھی اپنے اپنے انداز سے دلائل پیش کیے ہیں۔ اُن میں سے چند اقتباسات درجِ ذیل ہیں۔

تاریخ وسیرت کے محقق سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"سوال یہ ہے کہ ایک ملک کا مشہور واقعہ جو دوسرے ملک کی معاصر تاریخوں میں مذکور نہ ہو۔ صرف اُس کا یہ عدم ذکر کیا اُس کے انکار کی سند ہو سکتا ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو ہندوؤں کی مہابھارت کا تم انکار کر سکتے ہو۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے تمام معجزات، بلکہ واقعاتِ زندگی تک کا انکار کر سکتے ہو کہ شام و مصر کے معاصر رومی مورخوں نے ایسے عجیب و غریب واقعات کا ایک حرف بھی قلم بند نہیں کیا۔ اِس کے برخلاف ابھی اوپر کی روایتوں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ عرب و شام سے آنے والے مسافروں نے یہ بیان کیا کہ اُنھوں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا ہے۔" (سیرت النبی 3/ 311)

اُنھوں نے مزید لکھا ہے:

"اللہ نے یہ نشانی اہل مکہ کے لیے ظاہر کی تھی اور اُنھی کے لیے یہ آئینۂ ثبوت تھی۔ اِس لیے تمام دنیا میں اِس کے ظہور اور رؤیت کی حاجت نہ تھی۔ اِس بنا پر بالفرض اگر دنیا کے دوسرے حصوں میں شق قمر مشاہدہ نہ ہوا ہو تو یہ حیرت اور تعجب کی بات نہیں۔ بلکہ اہل مکہ کے علاوہ اور لوگوں کو دوسرے شہروں اور ملکوں میں اِس کا نظر نہ آنا ہی مصلحت الٰہی تھی کہ اگر یہ عام طور سے دوسرے اقطاع عالم کے لوگوں کو بھی نظر آتا تو یہ سمجھا جا سکتا کہ یہ آسمان کے طبعی انقلاب میں سے کوئی انقلاب تھا، جیسا کہ اور سینکڑوں قسم کے تغیرات اِس سے پہلے ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ فلکیات اور علم بدء خلق (کسمو گریفی اور نیچرل ہسٹری) میں مذکور ہے۔ لیکن جب اہل مکہ کے علاوہ جو شہر میں تھے یا باہر قافلہ میں تھے صرف اُنھی کو نظر آیا، تو اِس بات کی صاف اور صریح دلیل ہے کہ یہ صرف آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نشان کے طور پر ظاہر ہوا۔ وللہ الحمد۔"

(سیرت النبی 3/312)

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اِس اعتراض پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"(یہ اعتراض) اِس لیے بے وزن ہے کہ یہ واقعہ اچانک بس ایک لحظہ کے لیے پیش آیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اِس خاص لمحے میں دنیا بھر کی نگاہیں چاند کی طرف لگی ہوئی ہوں۔ اِس سے کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا کہ لوگوں کی توجہ اِس کی طرف منعطف ہوتی۔ پہلے سے کوئی اطلاع اِس کی نہ تھی کہ لوگ اِس کے منتظر ہو کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوتے۔ پورے روے زمین پر اِسے دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا، بلکہ صرف عرب اور اُس کے مشرقی جانب کے ممالک ہی میں اُس وقت چاند نکلا ہوا تھا۔ تاریخ نگاری کا ذوق اور فن بھی اُس وقت تک اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ مشرقی ممالک میں جن لوگوں نے اِسے دیکھا ہوتا، وہ اِسے ثبت کر لیتے اور کسی مورخ کے پاس یہ شہادتیں جمع ہوتیں اور وہ تاریخ کی کسی کتاب میں اِن کو درج کر لیتا۔ تاہم، مالابار کی تاریخوں میں یہ ذکر آیا ہے کہ اُس رات وہاں کے ایک راجہ نے یہ منظر دیکھا تھا۔ رہیں علم نجوم کی کتابیں اور جنتریاں، تو اُن میں اِس کا ذکر آنا صرف اِس حالت میں ضروری تھا، جب کہ چاند کی رفتار، اور اُس کی گردش کے راستے، اور اُس کے طلوع و غروب کے اوقات میں اِس سے کوئی فرق واقع ہوا ہوتا۔ یہ صورت چونکہ پیش نہیں آئی، اِس لیے قدیم زمانے کے اہل تنجیم کی توجہ اِس کی طرف منعطف نہیں ہوئی۔ اِس زمانے میں رصد گاہیں اِس حد تک ترقی یافتہ نہ تھیں کہ افلاک میں پیش آنے والے ہر واقعہ کا نوٹس لیتیں اور اُس کو ریکارڈ پر محفوظ کر لیتیں۔"

(تفہیم القرآن 5/230-231)

مولانا امین احسن اصلاحی نے اِس اعتراض کا نہایت مسکت جواب دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ شبہ صحیح نہیں ہے کہ اِس طرح کا کوئی واقعہ پیش آیا ہوتا تو دوسری قوموں کی تاریخ میں بھی اِس کا ذکر ہوتا۔ ہماری زمین اور دوسرے کُرّوں میں اِس طرح کی شکست و

ریخت اور اُن کے ٹکڑوں کے درمیان انفصال و اتصال کے کتنے واقعات ہیں، جو آئے دن ہوتے رہتے ہیں، لیکن پہلے زمانہ میں اِن کا مشاہدہ ایک خاص دائرہ ہی کے اندر محدود رہتا تھا۔ ہمارے زمانے میں اِس طرح کے تغیرات کی تحقیق کے لیے بین الاقوامی ادارے اور رصدگاہیں وجود میں آگئی ہیں، اِس وجہ سے کوئی واقعہ ظہور میں آتا ہے تو اُس کی تحقیق کے لیے فوراً ساری دنیا کے تحقیقاتی ادارے بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہیں اور برق کی رفتار سے اُس کی اطلاع دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ جاتی ہے۔ پہلے تحقیق و اطلاع کے یہ وسائل موجود نہیں تھے، اِس وجہ سے اُس کی خبر ایک خاص دائرے ہی میں محدود رہ گئی۔ لیکن یہ دائرہ نہایت ثقہ لوگوں کا ہے، اِس وجہ سے نفس واقعہ کی تکذیب کی کوئی وجہ نہیں ہے۔“

(تدبر قرآن 8/92)

ضمیمہ 3

شق قمر پر ماہرین فلکیات اور سائنس کی خاموشی

ایک اعتراض کا جواب

شق قمر کے وقوع پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ یہ واقعہ علم فلکیات سے متعلق ہے، مگر نہ اِسے زمانۂ رسالت کے ماہرین فلکیات نے بیان کیا ہے اور نہ دورِ حاضر کی رصد گاہوں اور سائنسی آلات نے اِس کی تصدیق کی ہے۔ لہٰذا یہ واقعہ علمی لحاظ سے ثابت نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک یہ اعتراض درجِ ذیل وجوہ سے درست نہیں ہے۔

اولاً، اِس بات کے شواہد دستیاب نہیں ہیں کہ زمانۂ رسالت میں سرزمین حجاز میں ایسے لوگ موجود تھے، جو اِس طرح کے علوم وفنون میں دل چسپی اور مہارت رکھتے ہوں۔ اگر کسی خطے میں ایک علم و فن کے ماہرین موجود نہ ہوں تو وہاں اِس سے متعلق اطلاعات کے محفوظ رہنے اور آگے منتقل ہونے کی توقع غیر حقیقی ہے۔

ثانیاً، قرآن و حدیث میں واقعے کے بیان سے واضح ہے کہ اِس کے نتیجے میں چاند کی گردش پر کوئی اثر واقع نہیں ہوا تھا۔ اگر چاند کی گردش رکتی تو اُس کی رفتار کا حساب رکھنے والے منجمین، ممکن ہے کہ اِس امر کی طرف متوجہ ہوتے۔ اُس صورت میں بھی یہ سوال بہر حال قائم رہتا ہے کہ آیا وہ یہ مہارت رکھتے تھے کہ چاند کی گردشِ محوری اور گردشِ دوری میں لحظہ بھر کے تعطل کو متعین کر سکیں؟

ثالثاً، اِس اعتراض پر اہم ترین سوال یہ ہے کہ کیا واقعے کے وقوع سے تادم تحریر کسی ماہر فلکیات نے، کسی رصد گاہ نے، کسی سائنس دان نے یا کسی تحقیقی ادارے نے شق قمر کے واقعے کی تحقیق کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی ہے؟ ہمارے علم کی حد تک اِس کا جواب نفی میں ہے۔ عین ممکن ہے کہ چاند پر جا کر اِس کی گہری تحقیق کی جائے تو اِس کے شق ہونے کے آثار دستیاب ہو جائیں۔

رابعاً، یہ بھی ممکن ہے کہ شق ہونے کے بعد جب دونوں ٹکڑے دوبارہ جڑے ہوں تو پہلی حالت کے عین مطابق بہ تمام و کمال جڑ گئے ہوں۔ یعنی شکست و ریخت کا معمولی شائبہ بھی باقی نہ رہا ہو۔ بالکل اُسی طرح جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار پرندے ذبح کر کے الگ الگ پہاڑوں پر رکھے اور پھر اُنھیں پکارا تو وہ اللہ کے حکم سے اُسی حالت میں واپس آ گئے، جیسے ذبح ہونے سے پہلے تھے۔ یہ واقعہ سورۂ بقرہ میں نقل ہوا ہے۔ ارشاد ہے:

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ.(260:2)

”اور (اِس سلسلے میں) وہ واقعہ بھی پیش نظر رہے، جب ابراہیم نے کہا تھا کہ پروردگار، مجھے دکھا دیں کہ آپ مردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ فرمایا: کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟ عرض کیا: ایمان تو رکھتا ہوں، لیکن خواہش ہے کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ فرمایا: اچھا، تو چار پرندے لو، پھر اُن کو اپنے ساتھ ہلا لو، پھر (اُن کو ذبح کر کے) ہر پہاڑی پر اُن میں سے ایک ایک کو رکھ دو، پھر اُنھیں پکارو، وہ (زندہ ہو کر) دوڑتے ہوئے تمھارے

پاس آجائیں گے، اور (آیندہ کے لیے)
خوب سمجھ لو کہ اللہ زبردست ہے، وہ
بڑی حکمت والا ہے۔"

ہمارے اہل علم نے بھی اِس اعتراض پر سیر حاصل کلام کیا ہے۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"حوادث فلکی کے حدوث اور وقوع میں بڑی چیز یہ ہے کہ اُس کا مشاہدہ مطالع اور مغارب پر موقوف ہے اور ہر جگہ کے مطالع و مغارب دوسری جگہ سے نہایت مختلف ہیں۔ بلکہ بالخصوص قمر کے مطالع میں تو اور بھی سخت اختلاف ہے اور ایک جگہ چاند ڈوبتا ہے دوسری جگہ نکلتا ہے، ایک جگہ چاندنی ہے دوسری جگہ اندھیرا ہوتا ہے، ایک جگہ چاند کو گہن لگتا ہے اور دوسرے مقامات کے لوگوں کو وہ نظر تک نہیں آتا۔ اِس لیے اگر تمام دنیا نے اِس معجزہ کو نہیں دیکھا تو یہ شق قمر کی نفی کی دلیل نہیں۔ چنانچہ دنیا کی مختلف باخبر قوموں نے اپنی اپنی کتابوں میں مختلف حوادث فلکی کا ذکر کیا ہے، لیکن جس واقعہ کو ایک نے بڑے شد و مد سے بیان کیا ہے، اُس کی معاصر قوموں کی کتابیں اُس کی شہادت سے قطعاً خالی ہیں۔ لیکن کیا یہ خاموشی اُس کے عدم وقوع کی سند ہو سکتی ہے؟ علاوہ اور وجوہ کے اِس خاموشی اور اختلاف کی ایک وجہ یہی ہوتی ہے کہ تمام دنیا کا ایک مطلع نہیں ہے۔ اِس لیے ایک چیز ایک جگہ نظر آتی ہے، دوسری جگہ نہیں آتی۔" (سیرت النبی 3/312)

سید ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

"موجودہ دور میں سیاروں کی ساخت کے متعلق انسان کو جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، اُن کی بنا پر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک کرّہ اپنے اندر کی آتش فشانی کے باعث پھٹ جائے اور اُس زبردست انفجار سے اُس کے دو ٹکڑے دور تک چلے جائیں، اور پھر اپنے مرکز کی مقناطیسی قوت کے سبب سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ آملیں۔

...رہیں علم نجوم کی کتابیں اور جنتریاں، تو اُن میں اِس کا ذکر آنا صرف اُس حالت میں

ضروری تھا، جب کہ چاند کی رفتار، اور اُس کی گردش کے راستے، اور اُس کے طلوع و غروب کے اوقات میں اِس سے کوئی فرق واقع ہوا ہوتا۔ یہ صورت چونکہ پیش نہیں آئی، اِس لیے قدیم زمانے کے اہل تنجیم کی توجہ اِس کی طرف منعطف نہیں ہوئی۔ اُس زمانے میں رصد گاہیں اِس حد تک ترقی یافتہ نہ تھیں کہ افلاک میں پیش آنے والے ہر واقعہ کا نوٹس لیتیں اور اُس کو ریکارڈ پر محفوظ کر لیتیں۔" (تفہیم القرآن 5/230-231)

مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

"ہو سکتا ہے کہ کل کو سائنس دانوں کے لیے چاند کی تحقیق کی وسیع راہیں کھل جائیں اور علمی تحقیقات سے ثابت ہو جائے کہ چاند کا فلاں حصہ فلاں حصہ سے مربوط تھا، لیکن اتنے سو سال پہلے وہ الگ ہو کر فلاں حصے سے جا ملا۔ اِس طرح کے کتنے انکشافات ہیں، جو ہمارے کرۂ ارض سے متعلق آج ہمارے سامنے آ رہے ہیں اور لوگ اُن کو باور کر رہے ہیں تو آخر چاند سے متعلق قرآن کی اِس خبر پر تعجب کی کیا وجہ ہے؟ سائنس نے اگر ابھی اِس کی تصدیق نہیں کی ہے تو یہ اُس کی نارسائی کی دلیل ہے۔ انتظار اور صبر کیجیے، شاید مستقبل میں وہ بھی اِس کے اعتراف پر مجبور ہو جائے۔" (تدبر قرآن 8/92)

ضمیمہ 4

لفظ 'آیۃ' کے مختلف مصداقات

ایک اشکال کی وضاحت

اِس تالیف کا ابتدائی باب "'آیۃ' کا مفہوم و مصداق" کے زیرِ عنوان ہے۔ اُس میں بیان ہوا ہے کہ 'آیۃ' کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔ قرآنِ مجید میں یہ بہ طورِ اصطلاح آیا ہے اور چار مختلف اطلاقات کے لیے استعمال ہوا ہے۔ کسی مقام پر اِن چار اطلاقات میں سے کون سا اطلاق صادق آتا ہے، اِس کا تعین کلام کرتا ہے۔ اِس بات پر بادی النظر میں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک لفظ چار مختلف مصداقات کا حامل ہو، وہ چاروں ایک ہی کلام میں استعمال ہوئے ہوں اور اِن میں تفریق کرنا بھی ممکن ہو؟

ہمارے نزدیک کسی لفظ کا ایک سے زیادہ مفاہیم اور اطلاقات کے لیے استعمال ہو جانا زبان و بیان کا عام اسلوب ہے۔ قرآنِ مجید سے اِس کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اِن میں سے ایک معروف اور عام فہم مثال لفظِ "ذکر" کی ہے۔ یہ لفظ کئی مفاہیم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر:

1۔ سورۂ بقرہ میں یہ یاد کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ بنی اسرائیل کو فرمایا ہے:

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ.(40:2)

”(قرآن تمھارے لیے یہی ہدایت لے کر آیاہے، اِس لیے) اے بنی اسرائیل، میری اُس نعمت کو یاد کرو، جو میں نے تم پر کی تھی اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔“

2۔ سورۂ مائدہ میں یہی لفظ زبان سے نام لینے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ .

”وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ اُن کے لیے کیا چیز حلال ٹھیرائی گئی ہے؟ کہہ دو: تمام پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال ہیں اور شکاری جانوروں میں سے جن کو تم نے شکار پر دوڑانے کے لیے سدھالیاہے، جنھیں تم اُس علم میں سے کچھ سکھا کر سدھاتے ہو، جو اللہ نے تمھیں سکھایا ہے، (اُن کا کیا ہوا شکار بھی حلال ہے)۔

فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ.(4:5)

اِس لیے جو وہ تمھارے لیے روک رکھیں، اُس میں سے کھاؤ اور (جانور کو شکار پر چھوڑنے سے پہلے) اُس پر اللہ کا نام لے لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک، اللہ بہت جلد حساب چکانے

والا ہے۔"

3۔ آلِ عمران میں یہ لفظ اِس طرح آیا ہے کہ دل کی یاد اور زبان کا اظہار، دونوں کو شامل ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ. الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ.... (191-190:3)

"(یہ عقل کے اندھے ہیں، اِس لیے پیغمبر پر ایمان کے لیے نشانی مانگتے ہیں، ورنہ) حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کے بنانے میں اور دن اور رات کے باری باری آنے میں اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، جو بصیرت والے ہیں۔ اُن کے لیے جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے اور زمین اور آسمانوں کی خِلقت میں غور کرتے رہتے ہیں...۔"

4۔ سورۂ انبیاء میں یہ کسی کے بارے میں عام ذکر کرنے یا بات کرنے کے معنی میں مذکور ہے:

قَالُوۡا مَنۡ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ. قَالُوۡا سَمِعۡنَا فَتًی یَّذۡکُرُهُمۡ یُقَالُ لَهٗۤ اِبۡرٰهِیۡمُ. (60-59:21)

"(اُنھوں نے آکر بتوں کی یہ حالت دیکھی تو) کہنے لگے: ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی ہے؟ یقیناً وہ بڑا ہی ظالم ہے۔ لوگوں نے بتایا

کہ ہم نے ایک نوجوان کو اِنھیں کچھ برا
کہتے ہوئے سنا تھا، جس کو ابراہیم پکارتے
ہیں۔“

5۔ سورۂ احزاب میں بیان کرنے اور چرچا کرنے کے مفہوم میں آیا ہے:

وَ اذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا.(34:33)

”اور تمھارے گھروں میں اللہ کی آیتوں اور اُس کی حکمت کی جو تعلیم دی جاتی ہے، اُس کا چرچا کرو۔ بے شک، اللہ بڑا ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔“

6۔ سورۂ مائدہ میں یہ لفظ یاددہانی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے:

وَ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰۤى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ....(14:5)

”اِسی طرح ہم نے اُن سے بھی عہد لیا تھا، جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ پھر جس چیز کے ذریعے سے اُنھیں یاددہانی کی گئی، اُس کا ایک حصہ وہ بھی بھلا بیٹھے....۔“

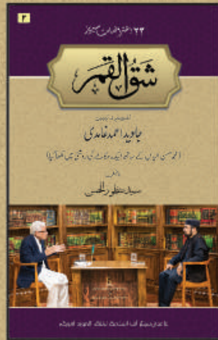

''شق القمر''، یعنی چاند کے دو حصوں میں پھٹ جانے کا واقعہ زمانۂ رسالت میں رونما ہوا تھا۔ اِس کا ذکر سورۂ قمر (54) کی ابتدائی آیات میں ہوا ہے۔ متعدد احادیث میں بھی اِس کی تفصیلات مذکور ہیں۔ قرآن اور حدیث کے اکثر شارحین اِسے معجزاتِ نبوت میں شامل کرتے اور اِس کے صدور کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرتے ہیں۔ بعض دیگر علما — مثلاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی — اِسے اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیتے ہیں، مگر معجزے کی معروف اصطلاح کا اطلاق اِس پر نہیں کرتے۔ اُن کے نزدیک اِسے معجزاتِ نبوت میں شمار کرنا علمی اور اصطلاحی لحاظ سے درست نہیں ہے۔ جناب جاوید احمد غامدی بھی اِسی رائے کے قائل ہیں۔ چنانچہ وہ شق قمر کو ایک حسی واقعہ مانتے اور پروردگارِ عالم کی قدرتِ کاملہ کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ کے انذار کی تائید اور آپ کے مکذبین کی تنبیہ کے لیے آیتِ الٰہی کے طور پر ظاہر ہوا تھا۔

سید منظور الحسن کی پیدایش 20 اپریل 1965 کو جنوبی پنجاب (پاکستان) کے شہر بہاول نگر میں ہوئی۔ والد سید محمد حسن شاہ تصوف کے سلسلۂ قادریہ کی مقامی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ گورنمنٹ سٹی ہائی اسکول بہاول نگر سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج بہاول نگر سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے سیاسیات اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے ایم اے اسلامیات کی ڈگریاں حاصل کیں۔ جی سی یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ عربی و اسلامیات سے ایم فل بھی مکمل کیا۔ ادب، سائنس اور اسلام کی بنیادی تعلیم اپنے شہر کے جید عالم اور عالی مرتبت استاد جناب محمد نذر صاحب سے حاصل کی۔ اُنھی کا فیض تربیت مدرسۂ فراہی کے جلیل القدر عالم اور محقق امام العصر جناب جاوید احمد غامدی کی دانش گاہ تک رسائی کا باعث بنا۔ اُن سے شرفِ تلمذ کا سلسلہ 1991ء سے قائم ہے۔ طالبِ علمی کے زمانے میں جن اساتذہ سے علوم و فنون کا اکتساب کیا، اُن میں سب سے نمایاں نام اردو اور عربی زبان و ادب کے نابغۂ روزگار ڈاکٹر خورشید رضوی کا ہے۔ اُن کے علاوہ ڈاکٹر سید سلطان شاہ، ڈاکٹر فاروق حیدر، ڈاکٹر حسن عسکری رضوی، ڈاکٹر جہانگیر تمیمی، جناب محمد رفیع مفتی اور جناب محمد ظفر عادل سے بھی کسبِ فیض کا موقع ملا۔ 'ادارۂ علم و تحقیق، المورد' کے فیلو ہیں اور 'غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ' کے مختلف تصنیفی اور تعلیمی منصوبوں میں شریک ہیں۔ ماہنامہ ''اشراق'' امریکہ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔

Ghamidi Center of Islamic Learning
www.ghamidi.org
AN INITIATIVE OF AL-MAWRID US